بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

نواب نصیرالدین احمد کی ہڈیاں مٹی ہوئیں خاک ہو چکیں۔ مگر ابھی اُن کی آنکھیں دیکھنے والے لوگ ہزار پانسو نہیں تو دو چار زندہ ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والا نصیر کس آن کا آدمی اور کس شان کا مسلمان تھا۔ دولت تھی۔ ثروت تھی۔ حکومت تھی۔ امارت تھی۔ مگر نخوت یا غرور کبھی پاس آکر نہ پھٹکا۔ باسٹھ سال سے اُوپر عمر پائی۔ پنڈروں کا رئیس۔ مزاج کا غنی۔ دل کا شیر۔ روپے کے ڈھیر تھے۔ دولت کی افراط تھی۔ حویلی مکان۔ جائداد۔ املاک۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر جس سے ملا جھک کر اور جس سے بولا ہنس کر۔ دونوں وقت لنگر عام تھا۔ جس میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔ غریب غربا اپاہج۔ فقیر ایک نصیر کے دسترخوان سے سینکڑوں بندگانِ خدا پل رہے تھے۔ پھر یہ نہیں کہ کرم اور احسان۔ جس کو دیا اور جب دیا منّت سے اور خوشامد سے۔ عجز کی یہ کیفیت کہ غریب پڑوسیوں کے گھر خود جاتا اور کھانا دیتا۔ خلق کا یہ حال کہ سائل کا سوال کبھی رد کیا نہ کرنے کا خیال آیا۔ اس دولت پر اور اس ثروت پر گرمی کے تیسوں روزے دیس ہو یا پردیس اور تندرست ہو یا بیمار ممکن نہیں کہ ناغہ ہوں۔ جاڑوں کی نماز فجر کڑکڑاتی سردی ہو یا چلّے کے دن ناممکن تھا کہ جماعت سے نہ پڑھے۔ وہ مر چکا مگر نصیری مسجد اور احمدی امام باڑہ آج تک اس کے کام اور اس کا نام روشن کر رہے ہیں۔

آدمی کیا ایک دریا اور مسلمان کیا ایک چشمہ تھا۔ جس کا فیض صبح سے
شام اور خاص سے عام تک جاری تھا۔ یتیم اس کے در سے رانڈیں اس کے
گھر سے۔ اپاہج اس کی دولت سے، مسکین اس کی ثروت سے زندہ تھے۔
اور خوش تھے۔ یہ تھی وجہ، یہ تھا سبب اور یہ تھا باعث کہ اس کے جنازے
پر بڈھوں نے پچھاڑیں کھائیں۔ جوانوں نے سر پھوڑے اور بچوں نے واویلا
مچائی۔ اب یہ اتفاق سے تعبیر کرو یا تقدیر سے کہ شہر بھر کے علاج اور دنیا
بھر کے جتن کر ڈالے۔ مگر بچہ نہ ہوا۔ اور بیوی بدنصیب اسی رنج میں گھل گھل
کر تمام ہوئی۔ یہ خیال کہ نصیر کی عمر اب نکاح کی نہ تھی درست نہیں۔ مرد ساٹھا
اور پاٹھا۔ عورت بیسی اور کھیسی۔ روپیہ تھا۔ اطمینان تھا۔ بے فکری تھی۔
خوشحالی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ غریب بقیہ عمر رنڈوے ٹوں بسر کرتا۔ ہاں جس بات پر
اعتراض ہو سکتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ راز نہیں۔ بات کھلی اور معاملہ صاف اور
حق یہ ہے کہ بنائے فساد جس نے برباد کیا یہ ہی ہے۔ نکاح کرتا۔ شوق سے کرتا
ایک نہیں دو کرتا۔ چالیس کیا ساٹھ برس کی عمر میں کرتا۔ مگر بات سمجھ کر اور موقع دیکھ کر
بیٹیوں کی کمی نہ تھی۔ کواری سے کواری اور بہتر سے بہتر لوگ بیٹی دیتے اور
چوم چاٹ کر دیتے۔ کواری نہ ہوتی رانڈ ہوتی۔ امیر نہ ہوتی۔ فقیر ہوتی۔ مگر ہڈی
کی اچھی اور خون کی سچی۔ گھر کی مغلانی اور مغلانی بھی وہ جس کی ماں کپڑے سیتے سیتے
اور نانی پانی ڈھوتے ڈھوتے مری۔ شکل کی کیسی ہی اعلیٰ اور صورت کی کتنی
ہی افضل کیوں نہ ہو۔ مگر حیثیت بھی ایک چیز ہے۔ نواب کی یہ غلطی جو مغلانی سے
نکاح کی صورت میں ظاہر ہوئی اتنی سنگین نہ ہو کہ اس پر الزام آسکے۔ مگر یہ خیال
بھی کچھ نہ کچھ وقعت رکھتا ہی ہے کہ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا
نہیں۔ لاکھ راجا کے گھر آئی اور رانی کہلائی۔ لیکن ہم تو یہ ہی سمجھیں گے اور

سمجھتے ہیں کہ اگر نصیر اعتنا کرتا تو بساندی بوٹی کا گندہ شوربہ نہ ہوتا۔

اولاد کا رنج فقط بیگم صاحب کی تقدیر میں تھا اس کے بعد تو مغلانی کی گود میں پہلے ہی سال چمکتا ہوا لال تھا۔ افسوس یہ ہے کہ نصیر کو بہار دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ضمیر چار ہی سال کا تھا کہ وہ رخصت ہوئے اور اس تمام اثاثہ کی مالک بی مغلانی ہوئیں۔

دوسرا باب

کہاں پندرہ بیس روپے ماہوار کی مغلانی اور کہا چار پانچ لاکھ روپے کا تعلقہ بلا شرکت غیرے اس کیلی کی ملکیت یا قبضہ میں تھا۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا۔ وہ بڑھ بڑھ کر بولتی اور چڑھ چڑھ کر کہتی کہ سننے والے بھی دنگ رہ جاتے مغلانی سے گھر والی ہوئی۔ گھر والی سے راج دلاری۔ جو کچھ کرتی ٹھیک اور جو کچھ نہ کرتی تھوڑا۔ اس پر ہوئی اولاد اور اولاد بھی بھاری پتھر نہیں چمکدار ہیرا۔ سنانی جو چاہتی اور کہتی جو جی میں آتا۔ مفلسی بری بلا ہے اور غرض اس سے بدتر۔ محتاج عزیز اور غریب رشتے دار سنتے جو کہتی۔ اور اٹھاتے جو ڈالتی۔ دولت سب سے بڑی عیب پوش ہے اچھی اچھی سیدانیاں اور بڑی بڑی مغل زادیاں اس کے اشارے پر آنکھیں بچھاتیں۔ خدا کی شان تھی الف کے نام بے نہ آتے۔ مگر جلسہ میں سب آ گئے۔ اور کلب میں سب سے پہلے۔ صورت تو اچھی تھی ہی اب لباس بھی کسی سے کم کیا بہتر ہی تھا۔ دھوم مچ گئی۔ سایہ بھی اور بوٹ بھی۔ کالر بھی اور سوٹ بھی۔ دہی وہ تھی۔ مگر وہ بچپن کے سنے سنائے دو چار کلمے اور الٹی سیدھی ایک آدھ آیت یاد تھی اس کا بھی کبھی نہ کبھی اثر ہو ہی جاتا تھا۔ روزانہ تو نہیں اور پنجگانہ بھی نہیں۔ مگر ہاں آٹھویں سویں ایک آدھ سجدہ بھی کر لیتی اور درود بھی پڑھ لیتی۔

ضمیر پلا اس ماں کے دودھ سے جو کام سے بیزار اور نام کی عاشق زار اور رہا ان آیاؤں کی گود میں جو روزے پر ہنسیں اور نماز پر کھلکھلائیں۔ انجام ظاہر تھا۔ بڑا ہوا تو کہنے کو مسلمان ورنہ پورا کرسٹان۔ روزے کا نہ نماز کا، نذر کا نہ نیاز کا۔ تعلیم کی کیفیت یہ تھی کہ پانچ چار کتابوں کے بعد پھر آگے نہ پڑھا۔ خود کا حال یہ تھا کہ بغیر انگریزی اخبار لئے گھر سے باہر نکلنا قسم۔ امیر کا بچہ اللہ آمین کا بچہ۔ لاڈ پیار کا بچہ۔ کھاتے پیتوں کا بچہ اس کے جوان ہونے میں کیا دیر تھی۔ چودہ برس کا لڑکا فیل کا فیل معلوم ہوتا تھا۔ مغلانی کو بیٹے کے بیاہ کا ارمان یوں تو مدت سے تھا۔ مگر اب تو ایک ایک گھڑی ایک ایک سال تھی۔ دنیا بھر کی لڑکیاں چھان اور شہر بھر کے گھر کھنگال ڈالے۔ مگر لڑکی سمجھ میں نہ آئی خدا خدا کر کے بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اور ایک جگہ بات ٹھہری۔ مغلانی روپے کی بھوکی نہ تھی سمجھتی تھی اور ٹھیک جانتی تھی، اور درست کہ دولت اتنی کافی اور روپیہ اس قدر وافر ہے کہ بھر بھر جھولیاں اٹھاؤں اور روپے کی جگہ اشرفیاں لٹاؤں تو بھی مجھ کو میرے بچہ کو اور دو تین پشتوں کو روپے کا توڑا نہ ہوگا۔ وہ صرف صورت کی جویا تھی اور حق یہ ہے کہ خود بھی چونکہ حسین تھی اور اتنی کہ اس بڑھاپے یا ادھیڑ پنے میں رانڈ ہو کر اور سہاگ کھو کر سو دو سو میں ایک تھی اس لئے اس کی تلاش غلط نہ تھی۔ لڑکی جو سمجھ میں آئی وہ مغلانی کی ٹکر کی تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی اچھی بہت اچھی۔ سسرال آئی تو دبی دبائی۔ مفلس غریب میاں کے رنگ اور ساس کے ڈھنگ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ مذہب تو اللہ کی عنایت سے گھر کیا محلہ بھر میں اللہ کا نام تھا۔ ہاں زنانہ کلب کی شرکت آندھی ہو یا مینہ ناغہ نہ ہوسکتی تھی۔ مغلانی کا بہو کو اپنے رستہ پر لانا ضروری تھا۔ چنانچہ لے آئی۔ کچی لکڑی کا سیدھا کرنا کونسی ٹیڑھی کھیر تھی۔ اشارے کی دیر تھی۔ بہو بھی اسی ڈگر پر پڑی۔ میاں کے وطیرے وہ کچھ کہ بغیر چھیڑی

کانٹے کے کھانے کو ہاتھ لگانا گناہ، ساس کے نزدیک یہ کچھ کہ ہندوستانی جوتی پہننی حرام۔ بہو بیچاری نے آخر کیا قصور کیا تھا۔ تھوڑے ہی روز میں ساس کم تھی اور بہو زیادہ۔ ہاں ایک بات تھی جو ساس کو ذرا کم مگر شوہر کو کچھ زیادہ ناگوار گذری اور وہ پانچوں وقت کی نماز تھی۔ بن باپ کی بچی اور مفلس ماں کی بیٹی۔ خدا مفلسوں کو بہت یاد آتا ہے۔ کوارپنے کے جمے جمائے خیال اور بیٹھے بٹھائے اثر جوانی میں اور تمول میں آسانی سے چھوٹنے والے نہ تھے۔ مزا یہ ہوا کہ سر پر آیا رمضان۔ مخلانی یا ضمیر کو تو غرض ہی کیا تھی کہ بھوکے رہتے اور پیاسے مرتے ضمیر تو کھلے خزانے اور ہانکے پکارے روزے داروں پر رات دن ہنستا۔ مگر مخلانی اتنا احسان اللہ پر ضرور کرتی کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیج دیتی اور یہ سمجھ کر کہ روزہ صرف غریبوں ہی کے لئے ہے یتیم خانہ میں بھی کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی۔ ایسے گھر میں اور اس قسم کے لوگوں میں رہ کر روزہ رکھنا آسان نہ تھا۔ دو تین روز تک تو دونوں ماں بیٹے خاموش رہے چوتھی سحری تھی کہ ضمیر نے ماں سے کہا۔

"یہ سحری کا عذاب تو اچھا پیچھے لگا کہ نیند بھی حرام ہو گئی۔ اول تو یوں ہی بارہ بجے سوتا ہوں اُس پر غضب یہ ہے کہ جہاں ایک دفعہ آنکھ کھل گئی تو پھر نیند نصیب نہیں۔ اگر ایسا ہی روزہ ضروری ہے تو آدمی اس طرح اُٹھے کہ دوسروں کی نیند برباد نہ ہو۔ دو تین روز سے یہ ہی ہو رہا ہے۔ اچھا رمضان آیا کہ سونے ہی کے لالے پڑ گئے"

ماں "بیٹا! غریبوں کے تو خدا اور رسولؐ الگ ہی ہوتے ہیں۔ مصیبت کی تکلیفیں ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں وہ بھگتتے ہیں۔ میں نے تو پرسوں بھی کہدیا تھا کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیج دیا کرو۔ مگر انہوں نے نہ سُنا اب ان ہی سے پوچھو میاں سنا کی۔ ساس ناخوش، روزے سے فائدہ

کیا اور حاصل کیا؟"

ضمیر "موٹی سی بات ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کی حالت ہی ایسی تھی کہ پیٹ کو ٹکڑا تھا نہ تن کو چیتھڑا۔ ایک رمضان پر ہی کیا منحصر تھا۔ یوں ہی بارہ مہینے کے فاقے تھے۔ اس وقت کی ضرورتیں اور تھیں اس وقت کی حالتیں اور ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ان مفلس جاہلوں کا کہ اب تک وہی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔"

ماں "تم اندر کی سہدری میں جا سو۔ کل سے کچھ اور انتظام کر دوں گی۔"

ضمیر دلہن جن کا اصلی نام ساجدہ تھا اس لائق تو تھی ہی نہیں کہ میاں یا ساس سے بحث کرتی۔ اول تو بہو، اس پر نئی دُلہن اور سونے پر سہاگہ افلاس دل ہی دل میں گڑھی جا رہی تھی۔ یہ دقت تو کٹ گیا اور دن گذر کر رات بھی آئی۔ مگر اس نیک بخت نے پھر سحری کا نام نہ لیا۔ دھمدنے کی آواز کان میں آئی اور چوروں کی طرح اُٹھ پانی پی کلی کر پڑ رہی وہ بھی اگر آنکھ کھل گئی۔ نہیں تو اوّل ہی شام نیت کی اور لیٹ گئی۔ آدمیوں کی ماشاءاللہ گھر میں کمی نہ تھی۔ چار پانچ مامائیں۔ پانچ چھ رشتہ دار۔ مغلانی، ضمیر، ساجدہ خاصے چودہ پندرہ مسلمان ایک گھر میں تھے۔ مگر سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی خیال میں ڈوبے ہوئے۔ روپیہ کی نخوت دونوں ماں بیٹوں پر کچھ اسی چھا گئی تھی کہ موت یا آخرت کا کبھی بھول کر بھی تو خیال نہ آتا تھا۔

روزے کیا کھلنے والے اور رمضان کیا رہنے والا تھا۔ آنکھ بند کر کے نکلے اور بات کرتے گذرے۔ عید سر پر آ پہنچی۔ اب البتہ مغلانی کا گھر مسلمان کا گھر تھا۔ مکان میں سفیدی ہوئی۔ زیور میں ڈورے پڑے۔ گاڑھا پر رنگ پھرا۔ کپڑا آیا۔ جوتیاں آئیں۔ غرض عید کی دھوم دھام میں مغلانی خاص اور عام سب پر سبقت لے گئی۔ اس مسرت میں شریک تو سارا گھر ہی تھا۔

مگر ساجدہ کے چہرے سے جو حقیقی مسرت ٹپک رہی تھی - اس کا پتہ دوسری جگہ نہ تھا - اس کی خوشی کپڑے کی تھی نہ لتے کی - گہنے کی تھی نہ پاتے کی - اسکی خوشی ادائیگی فرض کا تخیل تھا جس کی برابری ان فانی اشیاء میں ایک بھی نہ کرسکتا تھا -
اس کا صرف یہ اندیشہ تھا کہ خدا میرے روزے قبول کرلے - اس کو روزہ کی مقبولیت کی تمام جائداد سے قیمتی تھا - ہلالِ عید نے اپنا رُخ دکھا کر رمضان المبارک کو وداع کیا -
ساجدہ کوٹھے پر تھی - چاند دیکھا اور دُعا مانگی -

" الہ العالمین مجھ گنہگار کنیز کے گناہ معاف کیجیو - یہ مبارک مہینہ، برکت کے دن، رحمت کی راتیں ختم ہوئیں - مگر تیری نعمتیں موجود ہیں - اپنے فضل و کرم سے اپنے عطا و رحم سے میرے روزے قبول کر عذاب قبر سے محفوظ اور میرا سہاگ قائم رکھ "

دعا مانگ کر ساجدہ نیچے آئی - دوپٹہ سنبھال کر اوڑھا اور ساس کو جھک کر سلام کیا - اس کا دل ایسی مسرت سے لبریز تھا جس میں خوشی کا بحر بے پایاں لہریں لے رہا تھا - رات ختم ہوئی اور مؤذن نے روزِ عید کی آمد کا مژدہ پہنچایا - ساجدہ نے وضو کیا نماز پڑھی - غمیر نے غسل کیا کپڑے بدلے مغلانی نے کنگھی کی جوڑا پہنا اور عید کے جلسے ہونے لگے - دن بھر وہ گہا گہمی اور چہل پہل رہی کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی - منوں مٹھائی اچاروں ترکاریاں سیروں دودھ اور تولوں عطر صبح سے شام تک ہاتھوں سے اُٹھے - دن بھر ڈولیوں اور گاڑیوں کا تانتا لگا رہا -

روزِ عید میں کون سے لال لگے تھے کہ سال دو سال کا ہو جاتا - وہی بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات - دن کے ختم ہوتے ہی مردانے میں ناچ اور گھر میں گانا بجانا شروع ہوا - باہر انعام و اکرام سے اور اندر بیل - آدھی رات تک

یہ ہی دھوم دھام رہی۔ مغلانی دن بھر کی تھکی ہاری مسہری میں جا کر لیٹی۔ آنکھیں بند کیں اور سونے کی تیاری، ٹھنے پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوئے۔ دیکھتی ہے تو رشتہ کی خالہ زاد بہن بسم اللہ جو اوپر کا کام کرتی تھی۔ پاؤں دبا رہی ہے اور رو رہی ہے۔ پوچھا "کیا ہے؟" نہ معلوم تسکین کا نتیجہ تھا یا دل کی کیفیت طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی کوشش کی کہ چھپاؤں قصد کیا کہ ضبط کروں۔ مگر ناکام رہی۔ اتنے عرصہ میں مغلانی تین چار بار اصرار کر چکی تھی۔ جب چمکار کر دریافت کیا تو کہنے لگی۔

"کیا عرض کروں۔ آپ آرام فرمائیے"۔

مغلانی۔ "آخر کہہ تو سہی معاملہ کیا ہے"؟

بسم اللہ۔ "کچھ نہیں آپا یوں ہی خیال آ گیا"۔

مغلانی۔ "آخر وہ ایسا کیا خیال ہے"؟

بسم اللہ۔ "آپ آرام کیجئے اب نہ روؤں گی"۔

مغلانی۔ "مگر بتانے میں کیا قباحت ہے کسی نے کچھ کہہ دیا"۔

بسم اللہ۔ "جی نہیں"۔

مغلانی۔ "تو پھر یہ اس وقت رونے کا کیا سبب"؟

بسم اللہ۔ . . . .

مغلانی۔ "بتا میں پوچھ کر رہوں گی۔ بتا کیا ہوا"؟

بسم اللہ۔ "میں دن بھر خدا کی قدرت دیکھتی اور اپنی حالت پر غور کرتی رہی مجھ سے بڑھ کر کم بخت شاید دنیا میں کوئی بھی نہ ہو گا۔ سات مہینے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر کوئی دن اور رات ایسی نہیں جاتی۔ کہ جو بات آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو کانٹا دل میں کھٹک رہا ہے اس کو فراموش کر سکوں۔ کھاتی ہوں۔ پیتی ہوں۔ ہنستی ہوں۔ بولتی ہوں۔ دنیا کے سب کام اور

زندگی کی ہر ضرورت پوری کر رہی ہوں۔ بھوک مجھے لگتی ہے۔ پیاس مجھے معلوم ہوتی ہے۔ نیند مجھے آتی ہے۔ جاڑوں میں گرم کپڑے گرمی میں ٹھنڈا پانی کونسا کام ہے جو میں نے چھوڑ دیا۔ مگر دل کی وہ کلی جو آج ہی کے روز اسی وقت مرجھا گئی۔ اب نہیں کھل سکتی۔ وہ صورت جس کو موت نے مجھ سے چھین گہری گور سلا دیا۔ میری آنکھ سے جدا نہیں ہو سکتی میرا شوہر میرے سر کا وارث میری زندگی کا سہارا زیادہ دن نہیں، چند گھنٹے بیمار رہ کر اسی عید کی آدھی رات کو میری زندگی برباد کر گیا!۔

عید کا وہ دن جس خوشی سے بسر ہوا اب میسر آنے والا نہیں۔ اور رات کو جو ستم ٹوٹا۔ وہ دل سے جانے والا نہیں۔ شام کے وقت جب دل زیادہ تڑپا تو آپ سے تنخواہ مانگی۔ کہ میں بھی قبرستان جا کر اپنی عید منا لوں اور اس صورت کے بدلے اس خاک کے ڈھیر کو سلام عید کر لوں۔ آپ نے اس وقت کچھ نہ دیا۔ میں یوں ہی چلی گئی۔ رستے میں خیال آیا کہ مرنے والا دنیا بھر کے عیش کرا گیا اچھے سے اچھا پہنایا اور بہتر سے بہتر کھلایا آج تو اس کی قبر پر جس طرح بنے ہو آؤں۔ برس کا برس دن دنیا عید کی خوشیاں منا رہی ہے۔ کانوں کی بالیاں اسی کا صدقہ اور اسی کا طفیل ہے۔ جب وہ نہیں تو یہ رہ کر کیا کریں گی۔ ان کو بیچ کھجوریاں اور مٹھائی لیکر قبر پر پہونچی سینکڑوں ماں کے لال۔ بوڑھے بھی اور بچے بھی اور جوان شیر ہزاروں من مٹی کے نیچے دبے پڑے تھے۔ ننھی ننھی سی فقیرنیاں کچھ اپاہج اور معصوم بچے کھیلتے پھرتے تھے ان کو کھلایا اپنے ہاتھ سے پانی لائی اور پلایا اور دعا کی۔ کہ اس کا ثواب اس مرنے والے کی روح کو پہونچے جھٹپٹا ہو رہا تھا کہ ملاجی نے اذان دی۔ دل نہ مانتا تھا اس خیال سے کہ آپ ناخوش ہوں گی۔ چلی آئی مگر میرا دل وہیں پڑا ہوا ہے اور وہی رہ رہ کر یاد آ رہے ہیں۔

آپا گھنٹے نے ابھی بارہ بجائے ہیں۔ آدھی رات کا یہی وقت تھا جب مرنے والا میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اُس نے مجھ کو قریب بلا کر میرے سر پر ہاتھ رکھا تسکین دی اور خدا کے سپرد کیا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مر چکا اب رونا دھونا بیکار ہے۔ مگر دل کا علاج کیا کروں کہ یہ کم بخت اسکی صورت کو نہیں بھولتا۔ آپا آج ہی کے اُس کا انتقال ہوا تھا۔ اب وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے گا۔ مگر آنکھوں کا کیا کروں کہ یہ کسی طرح سے نہیں تھمتیں"۔

اتنا کہہ کر بسم اللہ کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ روتی ہوئی کمرہ سے باہر نکلی۔

اِدھر مخلانی خاموش تھی اور گھنٹہ بتا رہا تھا کہ رفتارِ عمر کس طرح طے ہوئی۔ شمع کہہ رہی تھی کہ رات سحر ہونے والی ہے۔ سوچنے لگی کہ یہ بیچاری بسم اللہ میرا ہاتھ تھکنے والی۔ اس طرح یادِ شوہر میں تڑپے اور میں جو ہزاروں صرف کروں کبھی بھول کر اس کا دھیان نہ کروں جس کی بدولت بیٹھی راج کر رہی ہوں۔

اس خیال کا آنا تھا کہ مرحوم کی تصویر آنکھ کے سامنے پھری۔ اور موت کی خوفناک گھڑی سامنے آئی۔ سوچنے لگی کہ موت بہر حال آنی اور یہاں سے جانا مگر وہاں جا کر کیا کروں گی یہ تمام عیش آرام یہ سب جلوے جیسے زندگی تک کے ہیں یہاں کی تمام ضرورتیں خوب پوری ہوئیں نفیس سے نفیس کپڑے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور قیمتی سے قیمتی بچھونا۔ افضل سے افضل کھانا۔ لیکن کوئی دن کیا کوئی گھڑی ایسی نہ گذری کہ وہاں کی ضرورتوں کا بھی خیال آتا اور سمجھتی کہ ایک روز اس زبردست بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جس کی حکومت ابدی اور جس کا راج مستقل میری صاحبی عارضی۔ میری خوشیاں فانی۔ اور میری امارت پانی کا بلبلہ دنیا کی ریت اور دودھ کا جھاگ! ان ہی خیالات میں غرقاب اور تفکرات میں اُلجھی کچھ دیر پڑی رہی

چاہا بہت کہ نیند آئے - مگر نہ آئی مجبورًا اُٹھی اِدھر ٹہلی اُدھر ٹہلی - بڑی داروغہ کو بُلا کر حکم دیا قصہ سُناؤ قصہ سنتی رہی - مگر نیند کسی عنوان آنی تھی اور نہ آئی دوسری داروغہ سے کہا کتاب پڑھو -

کتاب خواں - "شروع سے کوئی کتاب پڑھوں" -

مغلانی - "نہیں یہ لو - یہاں سے پڑھو" -

کتاب خواں - "جدت کی دھتیا اور مغرب کی رسیا کلب کے جلسے سے لوٹتی تھی گرمی کا موسم تھا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے فرحت بخش آ رہے تھے - گاڑی ساتھ تھی حکم دیا کہ گھر جاؤ - خود پیدل چلنے لگی - وقت سہانا تھا - اور ہوا سرد دُور نکل گئی اور ایسی سڑک پر جا پہنچی - جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی - چاروں طرف بھٹکتی پھری مگر کہیں رستہ نہ ملا - یہاں تک کہ رات نے سیاہی کا برقع روئے زمین کو اُڑھا دیا اور جنگل میں سناٹا چھا گیا - ہر طرف نگاہ دوڑائی - آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا - مگر آدمی نہ آدم زاد - دل ہَوا ہُوا - کلیجہ دھکڑ دھکڑ کرنے لگا - ہوا کے فرّاٹوں کے سوا اس اندھیرے گھپ میں اور کوئی آواز نہ تھی - چیخی چِلّائی دوڑی - لپکی - حیران پریشان ٹھہری بڑھی - مگر بے سود اور بیکار خوف کے مارے اور دہشت کے سبب دم نکل رہا تھا اور رُوح فنا ہو رہی تھی آسمان کے تارے بھی ٹمٹمانے لگا کر روپوش ہوئے اور سیاہ گھٹا نے ڈیرے ڈالے دفعتًہ اولوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی اور سفید چادر بیابان کے ہر چپے میں بچھ گئی - بادل کڑک رہے تھے مگر بجلی مطلق نہ تھی - اولے پڑ رہے تھے - لیکن مینہ بہت ہلکا تھا - بوندیاں تھیں مگر کم، جس کی پچھلی عمر، اس طرح بسر ہوئی کہ رنج خواب میں اور تکلیف بھُولے کبھی پاس آ کر نہ پھٹکی اس پر جو کچھ گذرتی وہ بیان سے باہر ہے - ساکت تھی - خاموش تھی سہمی ہوئی - ڈری ہوئی - لرز رہی تھی - تھرا رہی تھی - گھبرائی ہوئی -

ٹ پٹائی ہوئی۔ کبھی ادھر سے اُدھر بھاگتی اور کبھی ایک جگہ کھڑی ہو جاتی۔ مگر
طمینان کی کوئی صورت پناہ کی کوئی جگہ بستر آئی نہ نصیب ہوئی۔ گیدڑ چیخے۔
لنگور چلائے۔ سانپوں کی پھنکار تھی۔ اولوں کی بھرمار تھی۔ چٹانیں تھیں۔ پہاڑ
تھے۔ راکھ کے ڈھیر تھے۔ خاک کے انبار تھے اب جدّت کی شیدا بیگم کو یقین ہو گیا
کہ دم نکلا اور جان چلی۔ یہ قیامت خیز سماں یہ مصیبت انگیز وقت خدا دشمن کو بھی
نہ دکھائے۔ سنّاٹے کا میدان اور ہو کا عالم تھا۔ رستہ بتانا تو در کنار کوئی
بات تک کرنے والا نہ تھا۔ کپڑے چوڑا، بدن شور بہ شور ایک درخت کے نیچے
بیٹھ کر رونے لگی۔ خدا خدا کر کے سامنے سے روشنی نمودار ہوئی اور ایسا معلوم ہوا
کہ مرنیوالا شوہر ہاتھ میں چراغ لیئے روبرو کھڑا ہے۔ کپڑے سپید براق۔ لگی چیخیں مارنے
مگر ہوتا کیا تھا اور سنتا کون تھا بدن میں رعشہ، ہاتھ پاؤں میں کپکپی، چاہتی تھی زمین
میں دھنس جاؤں درخت میں گھس جاؤں کہ مردے نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا:—

رمضان کا مبارک مہینہ آئے اور نکل جائے فرشتے اور انسان
اس کے فراق پر آنسو گرائیں اور تجھ کو تیرے گھر والوں کو غیرت
تک نہ ہو۔ خدا کے نیک بندے اپنے معبود کے حکم کی تعمیل میں
لبیک کہیں اور تو ان پر خفا ہو۔ ایک نیک لڑکی، ایک مسلمان
عورت تجھ جیسی ناہنجار اور جفا شعار کے قبضہ میں پھنس کر سحری و
افطار سے محروم ہو۔ مسلمان کا گھر اور سحری گناہ۔ مظلوم تیرے
ظلم سے اور محکوم تیرے حکم سے دو گھونٹ پانی کے پی کر روزہ
رکھے۔ تو ڈٹ ڈٹ کر کھائے اور تن تن کر بیٹھے۔ اور روزہ دار
بارہ تیرہ گھنٹے کا پہاڑ سا دن گذار کر بھی پانی سے افطار کرے
افسوس تیری حالت پر اور شرم تیری صورت پر!!

بدبخت! وہ وقت زیادہ دور نہیں جو بتا دے گا کہ جس کو اپنا
سمجھا وہ غیر تھا۔ اور جس کو غیر جانا وہ اپنا تھا"۔

مغلانی شروع ہی کی سطریں سننے پائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں عمر گذشتہ
اور حالت موجودہ کا تمام نقشہ پھر گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ خود اسی کی تاریخ کوئی شخص
لکھ رہا ہے۔ بسم اللہ ہی کی مصیبت نے اس کی طبیعت خراب کر دی تھی۔ کتاب نے
بالکل ہی بے قابو کر دیا اور یہ حالت ہو گئی کہ گویا نصیبن اس کی بربادی کی داستان
بیان کر رہا ہے۔ سنتے ہی بیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ سب کو ہٹا دیا۔ بہت
دیر تک روتی رہی۔ اب نیند کہاں۔ کھڑی ہوئی اور صحن میں آئی تو پو پھٹ رہی تھی۔
اور یہ سماں بجائے خود اس قدر مؤثر تھا کہ ہر شے پر جو آنکھ کے سامنے تھی فنا کا جلوہ
برس رہا تھا اور رخصت ہوتی ہوئی رات جو مریض کی طرح دم توڑ رہی تھی آنے
والے مہمان سے گلے مل مل کر بے ثباتی دنیا کے نعرے لگا رہی تھی۔ اس منظر نے
یقین دلایا کہ موت سر پر آ پہونچی۔ ندامت کے آنسوؤں سے روتی ہوئی نماز کو کھڑی
ہوئی۔

تیسرا باب

بھلے گھوڑے کو ایک چابک، بھلے آدمی کو ایک بات! مغلانی اگر آدمی ہوتی
اور آدمی بھی سمجھدار، تو بسم اللہ کی داستان اور کتاب کا بیان دونوں عمارت
زندگی کی ان بنیادوں کے واسطے جو کمزور ہو چکی تھیں اڑواڑ کا کام دیتے اور
ڈگمگاتا ہوا ایمان پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جاتا۔ مر جاتی اور اس سبق کو نہ بھولتی۔
کھوئی ہوئی دولت اور گئی ہوئی نعمت خدا نے گھر بیٹھے بھیجی۔ مگر طبیعت میں شرافت
ہوتی اور اصلیت سے بےخبر نہ ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ دو چار دن تو تسبیح
بھی کھٹا کھٹ رہی اور نماز بھی جھپا جھپ۔ مگر ادھر تو لڑائی عقل ادھر گذرا وقت

وہ ڈر رہا نہ خوف نماز تو خیر گنڈے دار ہوئی مگر تسبیح کا جوش پندرہ دن بھی نہ رہا ۔ اور آخرکار دونوں الفاظ ۔ وہی دنیا اور دنیا کے دھندے ، وہی کلب اور کلب کے چندے ۔ اس گود کی اور اس دودھ کی ایسی ماں کی اور ایسی عورت کی اولاد جیسی اٹھتی ظاہر ہے ۔ ضمیر آغاز شباب ہی میں عذاب ثواب کا قائل نہ تھا اور اتنا مسلمان تھا کہ بیوی کی سحری اپنی نیند پر قربان کردی ۔ پورا جوان ہوا تو عمر کے ساتھ ہی ساتھ لامذہبی میں بھی ترقی کرتا گیا ۔ غصّہ اس پر آتا ہے کہ پڑھا نہیں لکھا نہیں مگر مشکل سے مشکل مسئلے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مرحلے میں رائے دینے کو موجود اور صلاح دینے کو تیار ۔ حدیث ۔ قرآن ۔ فقہ ۔ منطق کوئی بحث ایسی نہ تھی جس میں وہ بند اور کوئی گفتگو ایسی نہ تھی جس میں وہ خاموش ۔ مگر بڑی خرابی آکر یہ پڑی کہ میاں بیوی کے مزاج میں آسمان زمین کا فرق تھا ۔ ساجدہ اوّل اوّل تو میاں اور ساس کے رنگ دیکھ کر اسی طرف ڈھل گئی تھی ۔ بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے مگر میکے میں ایک روز وعظ تھا وہاں جو مولوی صاحب کی تقریر سنی تو لرز گئی اور عہد کرلیا کہ جان رہے یا جائے اور گھر بگڑے یا سنورے میں اس ترقی کی طرف قدم نہ اٹھاؤں گی ۔ جو درحقیقت تنزّل کا پوشیدہ راز ہے ۔ وعظ تو معمولی تھا مگر خاتمہ کے الفاظ جو ساجدہ کے دل میں گڑ گئے یہ تھے ۔

" بیویوں ! اگر وہ پہلی آواز جو فانی دنیا نے کان میں پہنچا کر ایک زبردست طاقت کا اعلان کیا یا د ہو تو صداقت کے کانوں سے سنو اور انصاف کی نظر اس شجرِ حیات پر ڈالو ۔

اس درخت پر رنگ برنگ کے طائر اپنی اپنی بولیاں بول گئے اور ایسے ایسے نغمے گا گئے کہ اب تک ان کا رس کانوں میں موجود ہے ۔ ان کا قیام ایک رات کا بسیرا تھا ۔ وہ اذان مغرب

کے ساتھ ان ڈالیوں پر چہکے اور نمازِ فجر سے قبل رخصت ہو گئے
اگر پانی کے وہ چند قطرے جو سب سے پہلے جسدِ خاکی پر پڑے اور جن کی تہ
میں غسلِ آخر پنہاں تھا۔ فراموش نہ ہوئے ہوں تو شوق کے قدم بڑھاؤ
ایمان کی آنکھیں کھولو اور دیکھو اس چمنستانِ زندگی میں ایسے ایسے
گلہائے رنگیں کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو نے ایک دنیا کو مہکا دیا۔
ان کا عرصہ حیات صرف ایک رات تھی۔ غروبِ آفتاب نے ان
کو زندہ کیا۔ اور صبا کی سرسراہٹ سے پہلے مرجھا گئے۔ اب وہ طائر
ہیں نہ پھول۔ مگر ان مسافروں کے نقش پا ابھی موجود ہیں۔ ان کے
کارنامے ماہِ کامل کی طرح روشن اور آبِ زلال کی طرح صاف
ہیں۔ آؤ باغیچۂ فانی کے ان سرسبز و شاداب پودوں پر نظر ڈالیں۔
جنہوں نے عورت کی ہستی میں ظہور کیا۔ آج بھی وہی چہرے ہیں۔
وہی صورتیں وہی مکھڑے ہیں وہی مورتیں۔ مگر ان چہروں پر وہ
نور، ان پھولوں میں وہ خوشبو، ان پودوں میں وہ طراوٹ نہیں
جو آج سے نصف صدی پیشتر تھی۔ ان قدموں پر قدم رکھو پتہ
ڈھونڈو اور سراغ لگاؤ۔ کوشش اس جگہ پہنچا دے گی۔ جہاں
تلاش کی آنکھیں تماشے دیکھیں گی۔ جن کے ساتھ ہی شانِ اسلام
کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ صورتیں دیکھو گے جن کی رگ رگ سے، وہ
گھر دیکھو گے جن کے چپے چپے سے اسلام کی صدائیں بلند ہوں گی۔ مگر
دل بھر کر دیکھنا، جی بھر کر ٹھہرنا اور پیٹ بھر کر دیکھ لینا آنکھیں ان
صورتوں کو جی ان باتوں کو۔ دل ان معاملات کو اور سنگا ہیں ان
خیالات کو ترسیں گی اور ناکام ڈھونڈیں گی، اور بے سود ہے وہ

عورتیں ہیں جن کے سفید بال متانت کی کنگھی سے آراستہ اور
جن کے خلوص بھرے دل صداقت کے پھولوں سے مزیّن
ہیں ان کے سروں پر جالی کے ڈوپٹے احمدآبادی اور گجراتی
بیلوں سے مزیّن نہ ہوں۔ مگر ان کی موٹی چادریں لٹھے اور نین سکھ
کی دہریں خوفِ خدا کے بیش بہا گنٹھوں اور گجروں سے مہک
رہی ہیں۔ یہاں تہذیب زبان سے کہنے اور قلم سے لکھنے کو
نہیں ہے، جھومر کی لڑیوں میں، مالا کے ڈوروں میں دمک رہا
ہے، چھالوں میں، اور بالوں میں، چٹیوں میں اور جالوں میں حیا
ان کا زیور ہے، شرم ان کا لباس، ادب ان کا جوہر ہے اور
رحم ان کا شیوہ، دیکھو سامنے دیکھو اور اس خاتون پر نظر ڈالو
یہ بال کامیابی حیات کا سہرا باندھ کر سفید ہوئے ہیں۔ یہ آنکھیں
گھڑیوں خوفِ خدا سے روئی ہیں اور یہ پیشانی گھنٹوں سجدے
میں رہی ہے یہ مفلس اور فقیر نہیں، وہ ہے جس کے ہاتھ سے
ہزاروں لاکھوں روپیہ عمر بھر اٹھا اور اب بھی ایک معقول خاندان
اور پورے گھرانے پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ نواسوں کی نانی
اور پوتوں کی دادی ہی نہیں نوکروں کی آقا اور لونڈیوں کی
مالک بھی ہے۔ اقبال کے سایہ میں جوانی بڑھاپے سے بدلی،
اور آج خلق کی زنجیر اس بوسیدہ گھر اور تنگ مکان میں گھسیٹ
کر لائی ہے۔ چھوٹے لڑکے کا بیاہ ہے اور مفلس بھانجی کو بلاوا
دینے خود آئی ہے!! اس منہ سے باتیں نہیں پھول جھڑ رہے ہیں یہ
پھول رہنے والے نہیں۔ اپنے دامن بھرو۔ زمانہ بہشت جلا چین اسلام کو

ان جوہروں سے محروم کرنے والا ہے۔ یہ واقعات نسانہ اور معاملات خواب وخیال ہوجائیں گے۔ صداقت کی شہادت پیش نظر رکھ کر ایمان کی ترازو ہاتھ میں لے کر فیصلہ کرنا اور بتانا کہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ لو دیکھو!

اے ہے مریم! قربان کی ننھی پیک۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ایک کہا چار کرتوں کی بھیدیتی۔ اس مردار نے مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔

مریم۔" خالہ اماں پیک کا کیا ہے۔ یہ تو میں نے ایک بات یوں ہی کہدی اللہ آپ کو شادی رچانی نصیب کرے۔ میں تو بڑی خوشی سے چلتی۔ مگر ادہر تو بچوں کو دیکھ لیجئے اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں اُس کے گانگن نکل رہی ہے اُدہر ان کے اپنے کھانے پینے کا کچھ انتظام نہیں۔ خدانے چاہا تو کسی چالے میں آکر شریک ہوجاؤں گی"۔

خالہ۔" بیٹی کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے بچے اچھے نہیں ہیں تو وہ بھی تو اپنا ہی گھر ہے۔ کسی غیر کا نہیں۔ جو ضرورت ہوگی انتظام ہوجائے گا۔ میاں کی تم نے خوب کہی۔ بیٹیاں میکے جاتی ہیں تو کیا داماد وں کے کھانے کا الگ انتظام ہوتا ہے۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ گھر والی کے آنے سے مرد کو کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بھی کہیں دنیا میں ہوا ہے کہ بیٹی کو تو بلا لیا اور داماد کو بھول گئے۔ پہلے کھانا ان کا پیچھے تمہارا۔ جو چھٹی روٹی اللہ دے گا۔ پہلے ان کو پہنچ جائیگا۔ پھر تمہارے آگے رکھیں گے بلاوا درحقیقت ان ہی کا ہے گر ے تم کو جارہی ہوں ابھی تو زمانہ نے اتنی ترقی نہیں کی کہ بیٹیوں سے واسطہ رکھیں اور داماد وں کے آرام سے غافل ہوجائیں"۔

بیٹی تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اور تمہاری شرکت لازمی ہے۔ کیا میرے دل میں وہم نہ آئیگا کہ سگی ماں جائی جہاں آرا کی بچی شہر کے شہر میں موجود ہو اور

دولہا کے سر پہ آنچل نہ ڈالے۔ میری آنکھیں تو آج تین دن سے جہاں آرا کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ وہ زندہ ہوتی تو بھانجے کو دولہا دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔

مریم۔ "یہ تو آپ درست فرماتی ہیں۔ مگر میری حالت کو بھی تو دیکھئے جہز گھٹا پاتا تو تقدیر کا ہے شکوہ نہیں۔ مگر کپڑے تو ڈھنگ کے ہوں۔ کچھ ایسی آکر پڑی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی آپ بڑی ہیں مگر بھائی تو چھوٹا ہے اس وقت تو آپ معاف کیجئے پھر دیکھی جائے گی"۔

خالہ۔ "لڑکی تیری عقل کو کیا ہوگیا۔ امیر غریب ایک ہی تھان کے ٹکڑے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ پتے کیسے ہی ہوجائیں۔ کوئی سبز ہے۔ کوئی زرد۔ مگر جڑ تو ایک ہی ہے۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ کپڑے اور گہنا لے آئی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھوؤ۔ کنگھی چوٹی کرو۔ بچوں کو نہلا دو۔ ان کے کپڑے بھی موجود ہیں۔ گاڑی تیار کھڑی ہے۔ مریم جلدی کر"۔

مریم۔ "کیا عرض کروں اس وقت تو جانے ہی دیجئے میں انشاء اللہ دو چار روز میں حاضر ہوں گی"۔

خالہ۔ "واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تم کو وہم نہیں آتا کہ بھائی کے سر پہ آنچل نہ ڈالو"۔

مریم۔ "پھر آپ فرمائیں گی کہ ان لڑکیوں کے دماغ بگڑ گئے ہیں۔ کیا آنچل ڈالنا نہایت ضروری چیز ہے۔ میں تو اس کو ایک فضول رسم سمجھتی ہوں آپ اس پر اس قدر زور کیوں دیتی ہیں"؟

خالہ۔ "میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا کہ ان لڑکیوں کے دماغ بگڑ گئے۔ ہاں یہ کہتی ہوں کہ جدت نے ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چکا چوند پیدا کردی ہے کہ اپنے اصلی جوہروں کو فراموش کررہی ہیں۔ تم اس آنچل ہی کو لے لو فضول کہہ رہی ہو۔

مگر اس میں ایجاد کرنے والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور رکھا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنچل اتنی ضروری چیز ہے کہ بغیر تمہارے آنچل کے نکاح ہی نہیں ہو سکتا یا تمہاری شرکت آنچل میں نہایت ضروری ہو۔ ہاں میں اس کی خوبیوں کی قائل ہوں اور یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم اپنی قدامت کی قدر نہیں کرتیں کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ بیٹی پرایا دھن ہے اور وہ شوہر کی ملکیت ہے شادی کے بعد جو حق شوہر کا اس پر ہے وہ والدین کا نہیں"۔

مریم۔" جی نہیں ہرگز انکار نہیں"۔

خالہ۔" بس تو جب یہ یقین ہے تو یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ داماد بیٹے بھی گو موجود ہیں۔ جن پر بیٹے قربان ہیں تو آستین کے سانپ بھی ہیں۔ ادھر ماں باپ کو اس سے زیادہ عمر میں کونسی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ اس خوشی میں بیٹی اور داماد کو بھی شریک کریں۔ کیونکہ شرکت کو وہ کسی طرح لازمی اور ضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ ہاں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنچل ڈالے اور بہنوئی دولہا بنائے۔ تاکہ داماد اس شرکت کو معمولی بات نہ سمجھے کچھ زد ران رسموں کا بھی پڑے اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہوا ہے دُور سے آیا ہے تو اس کا نیگ بھی مقرر کر دیا کہ ماں باپ دیکھ کر کہ بیٹی داماد کا کیا اُٹھا۔ اس رقم کو نہ صرف ادا کر دیں۔ بلکہ جیسا موقع ہو اس کی چاندی سے سلوک کریں"

دوسری بات اور ہے دولہا گھر میں آیا۔ وہ دولہا کی حیثیت سے تمہاری رائے میں ہشاش بشاش ہوگا۔ مگر ہماری رائے میں اس کی حیثیت میں شرم ہوتی ہے کہ بڑی بوڑھیوں کے سامنے دندناتا ہوا داخل ہو گیا۔ وہ اگر تنہا ہوگا تو اس کا حجاب اور ترقی کرے گا۔ اس لئے دروازہ ہی میں برابر کی بہنیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دفع کر دیں۔ ایک تیسری بات اور ہے دولہا اس سے پہلے

گھر میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دولہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے گھر کا رستہ بھی بتایا جائے۔ دولہن والیاں اس وقت سامنے آ نہیں سکتیں۔ کیا یہ معقول تدبیر نہیں ہے کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دے لیں۔ ایک چوتھی بات اور سُنو کچھ ضرورتیں ایسی پیش آئیں کہ چپکے سے کوئی بات دولہا سے کہنی ہے یا کچھ ہدایت کرنی ہے۔ کیا اس وقت کانا پھوسی کرنا بدتہذیبی نہیں ہے؟ آنچل کے بہانہ سے کیا یہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی؟ رہی پردے کی احتیاط وہ ظاہر ہے۔ یہ ہیں تمہارے قدیم طریقے جن پر آج منہ آتی ہو۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ رسمیں جو خود ہماری تجویز نہیں بلکہ دوسروں سے لے کر ہم نے اپنے ہاں شامل کرلیں۔ یقیناً قابلِ اصلاح ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے طریقے تو سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ اب تعلیم جو گُل کھلا رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کا بڑا حصہ محض نفسانیت کی ترقی ہے۔ ابھی پرسوں کی بات ہے میں تمہاری بہن کے ہاں بیٹھی تھی۔ فہمو کی ماں اتنے دنوں کی ماما تنخواہ مانگ رہی تھی بیوی دینے بیٹھیں تو چار دن کی بیماری کی تنخواہ صاف کاٹ لی۔ ہیں تو میرے پیٹ کی مگر میں تو دنگ رہ گئی۔ چھ سات برس کی خدمت کرنیوالی۔ چار دن بیمار ہوگئی تو یہ غضب مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے کہدیا "بیٹی یہ تو زیادتی ہے"۔ فرماتی کیا ہیں "آپ اس میں دخل نہ دیجئے نوکر اسی طرح درست رہتے ہیں"۔

بھلا بیوی میں یہ باتیں کیا جانوں۔ میں نے تو اماں جان کو دیکھا ہے ان کے پاس ایک ماما تھی۔ کرم بی اس کا ایک بھتیجا تھا فضلو۔ باپ ڈیڑھ مہینہ کا چھوڑ کر مرا کوئی دو سال کا ہوگا کہ ماں بھی مر گئی۔ پھوپھی کے ساتھ رہتا تھا۔ خاصا چودہ برس کا ہوگا کوٹھے پر کھڑا کنکوا اُڑا رہا تھا پاؤں پھسلا اور دو منزلے سے گر کر نیچے آیا۔ عمر تھی بچ گیا۔ مگر ایک ٹانگ ایسی بیکار ہوئی کہ دُنیا بھر کے علاج کر ڈالے اور کسی طرح آرام

نہ ہوا۔ بدنصیب کی ماں تھی نہ باپ ایک پھوپھی ہی پھوپھی تھی۔ اس درد سے رات بھر کراہتا کہ کلیجہ پر چوٹ لگتی۔ ڈیوڑھی میں پڑا رہتا تھا۔ اور کوئی اتنا نہ تھا کہ مکھی تک اڑا دے۔ رات کے وقت کرم بی جا کر تھوڑی دیر بیٹھ جاتی مگر بھائی کی اولاد اور اپنی اولاد میں یہ فرق ہوتا ہے کہ چند روز میں اکتا گئی۔ سچ مچ کا بے وارث تھا کہ دنیا کی کروڑہا مخلوق میں ایک زندہ روح ایسی نہ تھی کہ اس کی ٹانگ پر تیل کی مالش کر دے کرم بی بھی ٹل جاتی اور یتیم ایک ایک کا منہ تکتا اور تڑپتا۔ ایک رات کا ذکر ہے بارش ہو رہی تھی اور یہ مریض کے زخموں پر چھریوں کا کام کرتی تھی۔ کوئی نو بجے ہوں گے اس نے اماں جان کو بلایا وہ سامنے کا بچہ تھا۔ پردہ نہ کرتی تھیں۔ دونوں وقت کی روٹی اور دوا کو ایک پیسہ روز دیتی تھیں۔ ایک مٹکا اس کے سرہانے پانی کا اور چھ کی پائنتی رکھوا دی جب وہ گئیں تو فضلو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا :۔

"بیگم صاحب آج میری حالت خراب ہے۔ ہائے اب خدا کے سوا کوئی وارث نہیں۔ میرا اگر دنیا میں کوئی سہارا ہے تو آپ کی ذات۔ مجھے شام سے سردی بہت لگ رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دم نکل رہا ہے پھوپھی سے دو تین دفعہ کہا۔ نہیں سنا بیگم صاحب میں کانپ رہا ہوں اپنے بچوں کا صدقہ کوئی رضائی دے دیجئے"۔ اماں جان نے آ کر رضائی نکالی اور اپنے ہاتھ سے جا کر اڑھائی بات گئی گذری ہوئی۔ کوئی پندرہ دن بعد کا ذکر ہے کسی بات پر چھوٹی آپا کرم بی سے خفا ہو گئیں اور بات ایسی بڑھی کہ کرم بی اپنا اختر بختر سنبھال سیدھی ہوئی۔ چھوٹی آپا اس کا تو کچھ نہ کر سکیں۔ نزلہ بر عضو ضعیف۔ جھونجل اتری تو غریب پر گئیں اور کہا "جا تو بھی جا۔ جب پھوپھی ہی چلی گئی تو تیرا یہاں کیا کام"۔

اب ذرا اس وقت کا خیال کر لو ایک بن ماں باپ کا بچہ۔ اپاہج۔ یتیم ایک طرفہ تو گھر والی کے حکم سے اس حالت میں کہ وہ کروٹ بھی مشکل سے لے سکتا ہے

نکل رہا ہے۔ تم خود ہی اندازہ کرو کس طرح چارپائی سے اُترا اور چلا ایک بالشت چلتا ہے اور چیک کے مارے جان نکل نکل جاتی ہے۔ روتا ہے۔ چیختا ہے۔ چلّاتا ہے اور پھر تھم کر آگے بڑھتا ہے۔ تین چار گھنٹے میں مشکل سے دس بارہ گز چلا ہوگا۔ رات چاندنی تھی اور موسم سرد۔ بدنصیب لحاف لے جا سکا نہ چادر۔ ماہتاب نے مظلوم یتیم کو آغوش میں لیا۔ دس بجے ہوں گے کہ ابّا جان آئے اور آتے ہی پوچھا کہ "فضلو کہاں ہے"۔ چھوٹی آپا نے کہا کہ مرتی نکل گئی ہیں تو اُس کو بھی نکال دیا۔ وہ تو یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ بہت بُرا کیا۔ اماں جان نمازِ عشا پڑھ رہی تھیں۔ اور اُن کی نماز کا یہ حال تھا کہ مجھے یاد نہیں اُنہوں نے نماز کے آگے کسی چیز کی پروا کی ہو۔ یہاں تک کہ تمہاری امّاں کے مرنے کا تار آیا۔ بیماری کی خبر پہلے سے تھی۔ سب گھبرا گئے۔ مگر اُنہوں نے نماز نہ چھوڑی۔ مگر یہ سنتے ہی کہ فضلو کو نکال دیا اُنہوں نے سلام پھیر کر اتنا تو کہا:۔

"ہے ہے کم بخت یہ کیا ظلم کیا"

اور برقع ہاتھ میں لے ڈیوڑھی میں آئیں فضلو موڑ پر پڑا سسک رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں تو ابّا جان۔ رات خاصی آگئی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا اُن سے چارپائی پکڑوائی اس کے پاس گئیں جگایا اور چارپائی پر لٹا کر لائیں۔ ابّا جان چلے آئے وہ اس کے پاس بیٹھیں۔ سیدھی ہاں گئی۔ فضلو کی نگاہ ابّا جان کے چہرے پر تھی۔ اس میں کیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ مگر اتنا کہہ سکتی ہوں دنیا کی بیش قیمت سے بیش قیمت شے اس کی برابری نہیں کر سکتی۔

لو بیٹی مہر بجبر! چلو! جلدی کرو۔ میں تم کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ چھوڑوں گی نہیں۔

بہارِ قدامت ختم ہو چکی۔ غریب رشتہ داروں کا مان رکھنے والیاں

قبروں میں جا سوئیں۔ اب نفسانیت کا دور دورہ ہے"۔

تقریر کا اثر تھا یا وعظ کا نتیجہ یا بیٹوں کے خیالات کا جو اثر ساجدہ پر پڑا تھا ایسا زائل ہوا کہ چھینٹ بھی نہ رہی اور ایسی حالت میں ساجدہ کی زندگی ساس اور میاں دونوں کے واسطے خاصی مصیبت تھی۔ میاں کی زبان سے برسوں خدا کا نام نہ نکلے بیوی قدم بھی اٹھاتی تو بسم اللہ کہہ کر۔ باوجود اس عزت اور حشمت کے جو خدا نے اس کو دی۔ وہ میاں کی محبت۔ ساس کی عنایت اور اپنی حالت کو نہ بھولی۔ کھانسی، بخار، درد، کوئی تکلیف ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ نماز ناغہ ہو جائے۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں بیماری کی حالت میں ٹھنڈے برف پانی سے وضو منظور۔ مگر نماز کا نہ پڑھنا تو کیسا قضا پڑھنا بھی منظور نہیں۔ ضمیر نے اپنی طرف سے بہت سمجھایا۔ مگر اس نے نماز نہ چھوڑی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس نافرمانی کی سزا ساجدہ کو یہ ملتی کہ ضمیر اس کی صورت سے بیزار ہو جاتا اور یہ دیکھ کر کہ بخت اسی جہالت کا پیٹنا پیٹے جا رہی ہے۔ بات تک کرنی چھوڑ دیتا۔ مگر ایسا نہ ہوا اس سرتابی پر بھی ضمیر اس کی صورت کا دیوانہ تھا۔ اور اگر یہ نہ کہا جا سکے کہ ساجدہ کا خدا اس کے ساتھ تھا تو اس کہنے میں کیا تامل ہوگا کہ زیور پہن کر اور پیٹ بھر کر فاقے اور مصیبت ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے۔ اس نے جس طرح تکلیف کو عارضی اور اذیت کو فانی سمجھا اسی طرح راحت کو چھاؤں اور مسرت کو چاندنی۔ افسوس یہ ہے کہ مغلانی دنیا کی راحتوں کو جلد ختم کر گئی ورنہ وہ کم سے کم یہ دیکھ لیتی کہ لاپرواہی کے جو بیج وہ گھر میں بو رہی ہے۔ یہ آئندہ نسلوں تک کو غارت کر کے بھی پیچھا چھوڑنے والے نہیں۔ کچھ ایسی بڑھیا بھی نہ تھی۔ پچاس باون برس کی عمر۔ بندھی ہوئی کاٹھی۔ گٹھا ہوا بدن۔ آدھ سیر بالائی مرتے مرتے ناغہ نہ ہوئی۔ مرنے کی عمر تھی نہ اندیشہ تھا کہ نہ بیماری، خاصی اچھی بھلی چنگی۔

کلکتے سے آئی جون کا مہینہ تھا۔ گرمی تڑاقے کی پڑ رہی تھی۔ کچھ رستے کی تکان کچھ واقعی حبس۔ آتے ہی نہائی۔ نہا کر اٹھی بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ بخار چڑھا اور ساتھ ہی سینہ میں درد۔ اسی وقت ڈاکٹر لیڈی ڈاکٹر ہندوستانی ڈاکٹر گورا ڈاکٹر سب جمع ہو گئے۔ تین دن اور تین رات اسی طرح پڑی رہی چوتھے دن حالت بگڑ گئی۔ بہو تھی تو پرائی جائی۔ مگر ساس کی پٹی لمحہ بھر نہ چھوڑی۔ نجاست۔ صندل اور تھوک۔ امرت کر دیا۔ بھر بھر رومال بلغم کے اپنے ہاتھ سے پھینکتی اور تیوری پر بل نہ آتا وہ جس کا کام تھا۔ اُس اللہ کے بندے یعنی ضمیر نے ذرا پروانہ کی غیروں کی طرح دونوں وقت آیا۔ کھڑے کھڑے خیر صلاح پوچھی اور چلتا ہوا۔ ماں تڑپ رہی ہے اور بلک رہی ہے۔ مگر اس کے کان پر جوں نہیں چلتی۔ حد یہ ہے کہ ماں کا جنازہ احاطہ میں پڑا رہا۔ مگر وہ جب تک کنگھی۔ برش۔ کوٹ پتلون سے فارغ نہ ہو گیا۔ باہر نہ نکلا۔ بی مغلانی کو آخری وقت معلوم ہوا کہ جس صورت کی وہ دیوانی اور جس لال کی پروانہ تھی وہ بھی اپنا نہ تھا۔ چوتھے روز جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو اُس نے بیٹے اور بہو دونوں کو بٹھا کر کہا:۔

"اب میں دنیا سے رخصت ہوتی ہوں۔ لیکن اس خیال سے خوش ہوں کہ گھر اس عورت کے سپرد ہوتا ہے جو اس وقت کنبہ بھر کا مول ہے۔ میں خوش نصیب تھی کہ خدا نے مجھ کو ایسی بہو دی (اچھا بیوی میرے پاس آؤ۔ میرے گلے لگو۔ کہ میں تمکو خدا کے سپرد کر دوں"۔

ضمیر ماں کی یہ گفتگو سُن کر مُسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ مگر ساجدہ کی آنکھ سے آنسو گرنے لگے۔ وہ روتی ہوئی بڑھی۔ ساس کے ہاتھ کو بوسہ دیا تسکین دی۔ ضمیر کو گئے مشکل سے آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا کہ ماں دنیا سے رخصت ہوئی

چوتھا باب

جیسا دیس ویسا بھیس، وہی گھر تھا اور وہی گھر کے لوگ۔ مگر ایک ساجدہ نے حالات میں آسمان و زمین کا فرق کر دیا اور سوا ضمیر کے کوئی متنفس ایسا نہ رہا جو صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے نماز اور تلاوت کلام اللہ نہ کرتا ہو۔ مغلانی خدا اس کی رُوح کو نہ شرمائے خسیس نہ تھی خیرات بھی کرتی تھی اور زکوٰۃ بھی دیتی تھی۔ مگر اس کی ذات سے صرف خوشامدیوں کو فائدہ تھا جس نے آ کر دو باتیں ملائیں اور جھوٹی سچی خوشامد کی اسی کا کام بن گیا۔ ساجدہ دینے میں ساس سے بڑھی ہوئی تھی مگر موقعہ دیکھ کر اور حالت پہچان کر۔ بے نماز عورت سے تو وہ بات تک نہ کرتی اور تو اور حد یہ ہے کہ اگر دو چار دفعہ میاں کی اُلٹی سیدھی سن لیتی تو ایک آدھ دفعہ اپنا چھوٹا سا وعظ اس کو بھی سُنا ڈالتی۔ الختصر چند ہی مہینے میں ضمیر کا گھر ساجدہ کی بدولت خاصی چھوٹی سی مسجد بن گیا۔ ہر طرف سے اللہ اور رسولؐ ہی کی آوازیں آتی تھیں۔ میاں بیوی میں سلوک اور محبت اخلاق جو جو کچھ ہونا چاہیئے سب ہی کچھ تھا۔ مگر خیال کی مخالفت کسی طرح کم نہ ہوتی تھی اور گو اس اختلاف نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی۔ مگر خفیف سی بدمزگی اکثر ہو جاتی اور وہ اس طرح کہ ضمیر ہوا خوری کو تیار کھڑا ہے۔ بیوی سے رومال مانگا۔ وہ اللہ کی بندی سجدہ میں پڑی ہے۔ مجبور خود ڈھونڈ کر نکالا یا بیلا ہی لیے کر جانا پڑا۔ ساجدہ گو شرعاً ایسا کرنے کی مجاز تھی۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمیشہ اس کو محسوس کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ خدا کے فرض کی ادائگی شوہر کی خدمت میں رخنہ نہ ڈالے۔ ضمیر کو بھی اس کا یقین تھا

اور اسی وجہ سے وہ بعض دفعہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا تھا۔

دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے۔ مگر قدرت کا قانون خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتا ہے۔ مغلانی کو مرے شاید ڈیڑھ یا پونے دو سال ہوئے ہونگے کہ ساجدہ ایک بچی کی ماں بن گئی اور دوسرے ہی سال دوسری بچی کی۔ یہ دونوں بچیاں زاہدہ اور شاہدہ اگر دادی کی زندگی میں پیدا ہوتیں تو شاید ساجدہ کو ایک خاص حد تک ان کی پرورش سے سبکدوش ہو جاتی۔ لیکن اب ماں تھی تو وہ اور دادی تھی تو وہ۔ ضمیر اپنے خیالات میں ہمیشہ مست رہنے والا شخص تھا اتفاق کی بات ہے ایک روز وہ مغرب کے وقت ٹینس کھیل کر آیا تو بیوی بڑی بچی کو گود میں لئے باہر کھڑی تھی زاہدہ اس وقت خاصی ڈیڑھ برس کی تھی باپ کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ ہمک کر ہاتھ پھیلائے۔ باپ کا خون بھی جوش میں آیا اور گود میں لے ادہر ٹہلنے لگا۔ ڈیڑھ برس کی بچی کی بساط کیا تھی۔ ٹوپی کا پھندنا دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور پکڑنے لگی۔ ٹوپی باپ کے سر سے اتر کر بچی کے ہاتھ میں آئی اور زمین پر گر کر مٹی میں بھر گئی۔ غلطی خود ضمیر کی تھی جیسے بچی نے ٹوپی لی تھی نہ لینے دیتا یا لے کر پھر اوڑھ لیتا اس وقت تو خاموش ہو گیا۔ مگر جب نیچے گری اور مٹی میں بھری تو البتہ تیوری پر بل آگیا اور بیوں کی یوں ہی مٹی میں سنی کیچڑ میں بھری ٹوپی لے بچی کو اور ٹوپی کو بیوی کے سامنے لا کر پٹخ دیا اور کہا ڈیڑھ برس کی بچی اپنے مطلب کے سئے دنیا بھر کی باتیں بگھارنے کو موجود۔ کھانا یہ مانگے۔ پانی یہ طلب کرے۔ ٹکیا اسے مانگنی آئے مگر ٹوپی کو ٹوپی نہ سمجھے۔ لیکن اس میں معصوم کا کیا قصور جیسا اٹھایا ویسی اٹھی۔ جیسا سدھایا ویسی سدھی۔ بچہ ماں کے پیٹ سے کچھ سیکھ کر نہیں آتا۔ جس رستہ پر ڈال دیا پڑ گیا۔ تم جیسی قابل ماں کی گود سے جو زمانہ کو پہچانے نہ وقت کو دیکھے جتنے بدتمیز اور پھوہڑ بچے پیدا ہوں۔ درست اور

ٹھیک۔ خیر ایک کا ستیاناس تو ہوا تم جانو اور یہ بدنصیب جانے۔ اس کی تقدیر پھوٹنی تھی پھوٹی۔ مگر مہربانی فرما کر چھوٹی کی پرورش میں دخل نہ دینا۔ جس طرح میں چاہوں گا پال لوں گا اور پلوالوں گا۔"

ضمیر کا اتنا اشارہ ساجدہ جیسی عورت کے لئے کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ تھا۔ اس نے میاں کی بات گرہ میں باندھ لی اور شاہدہ سے دودھ کے سوا کوئی واسطہ نہ رکھا۔ باپ نے ایک نرس اور ایک کھلائی مقرر کر دی تھی۔ دن رات ان کے ہی پاس رہتی۔ صبح اپنے سامنے اس کو غسل کروانا۔ کپڑے بدلوانا۔ ناشتہ کروانا۔ دوپہر کو اپنے روبرو اس کو سبق دلوانا۔ پچھلا سُننا آگے پڑھوانا۔ شام کو اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جانا۔ سیر دکھانا۔ لکچر سُنانا۔ باتیں بتانا۔ آنکھ بند کر کے دن نکل گئے زاہدہ دسویں اور شاہدہ نویں سال میں تھی۔ کہ ایک روز شام کے وقت ضمیر شاہدہ کو لئے سیر سے واپس آ رہا تھا۔ نرس بھی ساتھ تھی۔ برج کے پاس آ کر گھوڑا بھڑکا اور اس بُری طرح کہ نہ اپنے سے رُکا نہ سائیس سے تھما۔ خدا کو کچھ بہتری کرنی منظور تھی۔ کہ جلدی سے ضمیر نے بچی کو نرس کی گود میں دیا۔ وہ پیچھے بیٹھی تھی جھٹ سے بچی کو لے کود پڑی۔ گھوڑا اسی طرح چمک رہا تھا۔ مارا چمکارا ڈانٹا ڈپٹا۔ مگر قابو میں نہ آیا۔ مجبور خود ضمیر بھی باگ چھوڑ کر دُور الگ جا کھڑا ہوا۔ ضمیر کے کودتے ہی گھوڑا گاڑی سمیت نالی میں گھوڑے کے بھی چوٹ آئی۔ گاڑی بھی چُورا ہو گئی۔ مگر جان بچی لاکھوں پائے۔ ضمیر کی نگاہ میں اس واقعہ کو خدا سے مطلق واسطہ نہ تھا۔ اس لئے نرس کو جو عیسائی تھی۔ سلامتی پر بہت بہت مبارکباد دی بچی کو اُٹھا کر پیار کیا۔ مُڑ کر دیکھتا ہے تو کیکر کے درخت کی جڑ میں ایک اپاہج اپنے زخم کمبل سے چھپائے پڑا ہوا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ تیوری پر بل ڈال کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اپاہج نے کہا:۔

"کچھ دے"

ضمیر کو سخت اور شاہدہ کو بہت ہی سخت ناگوار ہوا۔ ابھی بابا کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ شاہدہ بولی "کس قدر بدتہذیب آدمی ہے۔ ہم سے مانگنے کا اسے کیا حق حاصل ہے"۔

ضمیر "ان لوگوں میں بیکار رہتے رہتے یہ عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے کام بھی دوسروں پر ڈالدیں۔ کم بخت اپنا حق سمجھتے ہیں اسی واسطے لندن میں بھیک مانگنے کا حکم نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو محنت کرے اور پیٹ پالے"۔

شاہدہ "ان کی اس بے حیائی کے ذمہ دار ہم ہی ہیں اگر ان کو جھڑک دیں اور ان کو خود مصیبت اٹھانی پڑے تو یقیناً انکی عادتیں چھوٹ جائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی کوئی بیوقوف مسلمان ادھر سے نکلے گا تو پیسہ کیا کھانا تک ان کو کھلا دیگا"۔

اپاہج "آپ میرے قریب آیئے میرے زخموں کو ذرا دیکھئے۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ بھوک کے مارے مر رہا ہوں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں بندھی ہوئی ہیں اور کل شام سے پانی اور کھانے کو ترس رہا ہوں اب میری حالت رحم کے قابل ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ ہل سکوں بخار چڑھا ہوا ہے۔ کروٹ لے نہیں سکتا۔ میں نے آپ کو مسلمان سمجھ کر پیسہ مانگا تھا"۔

ضمیر "تیرے زخم دیکھ کر اپنی طبیعت بگاڑوں حالانکہ اس کے خیال سے میرا جی متلانے لگا۔ تیری نبض دیکھوں۔ بخار کا پتہ لگاؤں۔ چاہے وہ مرض متعدی ہی کیوں نہ ہو۔ تیرے جسم کو ہاتھ لگاؤں خواہ خود بھی بیمار پڑ جاؤں"۔

شاہدہ "چلئے بابا چلئے اس سے بات مت کیجئے"۔

گاڑی لوٹ چکی تھی اور سائیس بھی زخمی ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹیاں اور ترس پاؤں

پیدل گھر آئے۔ ساجدہ نے جب یہ واقعہ سُنا تو میاں سے یا بیٹی سے تو کچھ نہ کہا۔ وضو کر دو نفل شکرانہ کے پڑھے اور اسی وقت دس بچوں کا کھانا یتیم خانہ میں بھیجا۔ آدمی کھانا لے جا رہا تھا کہ ضمیر نے بھی دیکھا۔ ہنسا اور بیٹی سے کہا تم دیکھ رہی ہو تمہاری جاہل ماں کیا تماشے دکھا رہی ہیں"۔

شاہدہ۔ "جی ہاں وہ ان تمام باتوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہیں"۔

ضمیر۔ "مگر کوئی اس نیک بخت سے پوچھے کہ بیوقوف ان باتوں کا خدا سے واسطہ کیا۔ اگر جان خدا نے بچائی تو گھوڑے کو بھی اسی نے بھڑکایا۔ فرض کرو ہم سا نہ کودتا اور تم کود پڑتیں لیکن نہ اتر جاتی تو کیا تمہاری ماں کا خدا اس وقت بھی بچا لیتا۔ افسوس یہ ہے کہ جاہل ماں نے بڑی بچی کا بھی اپنے ساتھ ناس کیا یہی دیکھنا ہے کہ وہ خیالات کے اعتبار سے دوسری ماں ہے وہی جہالت وہی لغویت اور وہی حماقت"۔

اس واقعہ کو تیسرا مہینہ ہوا ہوگا کہ جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت ساجدہ کوٹھے پر نماز ظہر دھوپ میں پڑھ رہی تھی۔ اور زاہدہ ساتھ تھی۔ دونوں ماں بیٹیاں نماز پڑھ چکیں تو ساجدہ نے نیچے کے گھروں میں ایک نظر ڈالی۔ ضمیر کی کوٹھی کے پاس ایک چھوٹا سا محلہ آباد تھا۔ گھر کے نام سے مشہور تھا جس میں کچھ غریب اور بدنصیب لوگ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ساجدہ کی نظر ایک بیمار پر پڑی جس کے سرہانے ایک عورت بیٹھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ مریض کا مکان دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اور دالان جہاں مریض کا بستر تھا بالکل آنکھ کے سامنے اس میں صرف تین عورتیں تھیں ایک بڑھیا ایک رانڈ دوسری کنواری بیٹی۔ ان کے سر پر کوئی مرد نہ تھا اور بسر اوقات کا سلسلہ درزی کی سلائی اور گوٹے کی مزدوری تھی۔ شریف لوگ زمانہ کو جانتے اور وقت کو پہچانتے تھے۔ جو پڑی وہ جھیلی جو آئی وہ اٹھائی۔ جو میسر آیا وہ کھا لیا جو ملا پہن لیا۔ بڑھیا تھی تو غریب بلکہ فقیر مگر اس آن کی عورت اور شان کی آدمی کہ سوال

باطلبی تو درکنار یہ سُن کر اور سمجھ کر کہ ساجدہ کے ہاں خیرات ہو رہی ہے کبھی گھر کی ہوا تک نہ نکلنے دی۔ ساجدہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ بڑھیا جانماز پر تھی اور بیوہ بہن کنواری بہن کے پاس خون کے آنسو گرا رہی تھی۔ اس کی مفارقت کا خیال اسکی موت کا یقین اس کی وداع کا احتمال کلیجے پر برمے لگا رہا تھا۔ سردی سخت تھی اور ہوا تیز، شام قریب تھی، اور رات سر پر، بیمار بچی جس کے بدن پر اب بھی ایک پھٹی سی دُلائی کے سوا روئی کا کپڑا نام کو نہ تھا نمونیا میں بیہوش پڑی تھی۔ ماں اٹھی اور دوا کے بدلے اس کا منہ کھول کر دُعا دم کی۔ آنکھ سے آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ دوا کیواسطے پیسہ پاس نہ تھا۔ رات تینوں دموں پر صبا نکل چکی تھی۔ اور دن بھی اس فاقہ میں ختم کے قریب تھا کہ بیمار نے آنکھ کھولی اور کہا "بھوک لگ رہی ہے۔ کلیجہ نچ رہا ہے۔ دو چمچے دودھ کے دیدو" ماں نے بیٹی کی آواز سُنی اور قریب پہنچکر اسکے منہ پر ہاتھ پھیرا اور رو کر کہا "بیٹی پیسہ نہیں ہے رات سے اللہ ہی اللہ ہے" بیمار نے کچھ جواب نہ دیا کہ درزی نے آکر کہا "لاؤ کُرتہ دے دو"۔

بڑھیا "بھائی ابھی نہیں ہوا۔ بچی بیمار ہے۔ اس کی بیماری میں دونوں لگے ہوئے ہیں اللہ چاہے کل ضرور لے جانا"۔

درزی "کل؟ کرتے والا میلہ میں کیا پہن کر جائے بچی بیمار ہے تو جوتی کے صدقہ سے یہ پیسے جو پہلے دیدیئے وہ مُفت کے تھے۔ تم ہو بڑی بے غیرت کہ زبانی باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ لاؤ میں میرا کُرتہ یوں کا یوں ہی دے دو اور اب شریف ہو تو مجھ سے کپڑا نہ لینا"۔

بڑھیا "بیٹا قصور تو ضرور ہو گیا مگر معاملہ ایسا ہی تھا۔ بچی کے بچنے کی امید نہیں ایک پیسہ دوائی ٹھنڈائی کو نہیں۔ آج رات کو جس طرح ہوگا بڑی سے تیار کروا دونگی"۔

درزی "بس زیادہ باتیں نہ بناؤ تم بڑی نمازی پرہیزگار۔ دنیا بھر کی جھوٹی

مکار سیدھے ہاتھ سے کُرتہ اور دو آنے کے پیسے اِدھر رکھ"۔

بڑھیا:"بیٹا پیسہ تو ہے نہیں، کُرتہ حاضر ہے، چاہے چھوڑو چاہے لے جاؤ"۔

درزی:"میں نے تجھ جیسی سینکڑوں دیکھ لی ہیں۔ پیسے اِدھر رکھ دے"۔

بڑھیا باتیں کر رہی تھی۔ کہ بڑی بچّی نے گھبرا کر آواز دی "اے بی اماں۔ اِدھر تو آؤ دیکھو تو سہی اسے کیا ہو رہا ہے اس کے تو ہاتھ پاؤں مڑ رہے ہیں"۔

بڑھیا:"ہائے کیا کروں۔ اے بچّی خدا کے لئے آنکھ تو کھول۔ ننھی لے پانی تو پی۔ اس کے دانت بند ہو گئے۔ پانی کیوں کر ڈالوں؟ چمچہ بھی تو نہیں ہے"۔

درزی:"چمچے کی بچی میں تیرے باوا کا نوکر ہوں کہ دُکان چھوڑے تیرے گھر پر کھڑا رہوں لا جلدی سے کُرتہ اور پیسے"۔

بڑھیا:"بیٹا اللہ کی قسم پیسے تو نہیں ہیں۔ کُرتہ لے لو۔ یہ طشتری لے لو دو آنے کے بدلے"۔

درزی:"دیکھوں! یہ طشتری تو چار پیسہ کی بھی نہیں ہے۔ رنگ میں ڈوبی رنگ میں لتھڑی ہے کس کام کی"۔

بڑی لڑکی:"اچھی اماں خدا کے واسطے آؤ یہ تو منہ کھول رہی ہے۔ پانی تو ٹپکا دو"۔

بڑھیا:"بیٹا میں اور پیسے تم کو دیدوں گی۔ تم اب جاؤ"۔

درزی کُرتہ اور طشتری لے کر اُدھر گیا۔ بڑھیا اِدھر آئی تو مٹی کے آبخورے سے پانی بچی کے حلق میں ڈالا۔ ساجدہ اُوپر کھڑی یہ تمام واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اور زاہدہ کو دکھا بھی رہی تھی۔ جب پانی بیمار کے حلق سے زیادہ اُس کے اُوپر گرنے لگا اور اُس نے کراہنا شروع کیا۔ تو وہ بچّی کو لئے نیچے اُتری تو ضمیر بیٹھا ہوا شاہدہ سے کھیل رہا تھا۔

بیوی:"میں ذرا آٹھ گھرے تک جانا چاہتی ہوں، ہو آؤں؟"

ضمیر "کیوں خیریت۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی"؟

بیوی "نیم والی بڑی بی کے ہاں جاؤں گی"۔

ضمیر "وہ فقیرنی نگر گدی مغرور۔ اتنی کہ بھوکی رہے اور یہاں آکر جھانکے تک نہیں وہاں تمہارا جانا ہرگز تمہاری شان کے لائق نہیں"۔

بیوی "یہ ٹھیک ہے مگر اس وقت تو تم مجھ کو اجازت دے دو"۔

ضمیر "ایسی ہی ضرورت ہے تو چلی جاؤ۔ مگر اپنی عزت کو خود نہ سنبھالوگی تو یاد رکھو نوکروں تک کی نگاہ میں ذلیل ہو جاؤ گی۔ اس کا تو نصیب کھل جائے گا۔ کہ تم وہاں گئیں مگر تمہاری عزت میں فرق آئے گا"۔

بیوی "تم اجازت دے رہے ہو تو اس بحث کو جانے دو"۔

ضمیر "اچھا جاؤ چلی جاؤ"۔

بیوی "تم ذرا ڈاکٹر کو بلا دوا دو وہیں بھیج دینا"۔ ڈولی منگوا بچی کو ساتھ بٹھا بڑھیا کے پاس آئی۔ دروازہ میں کھڑے ہوکر پوچھا "میں آجاؤں"؟

دونوں ماں بیٹیاں سکتے میں رہ گئیں۔ آخر بڑھیا نے کہا "ہاں بیگم آجاؤ"۔

ساجدہ اندر پہونچی تو بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑھیا نے ایک کرا اپنا برقعہ بچھا دیا۔ اور کہا "بیگم اس پر بیٹھ جاؤ۔ ہمارے ہاں کوئی چیز آپ کے لائق تو ہے نہیں آپنے مجھے وہیں بلوا لیا ہوتا۔ میں آجاتی آپ نے کیوں تکلیف کی"۔

ساجدہ "تکلیف کی کیا بات ہے یہ چھوٹی بچی کیا بیمار ہے"؟

بڑھیا "بیوی کیا بتاؤں اگلے جمعہ کو صبح کی نماز خاصی اچھی طرح پڑھی۔ سر جکڑ رہا تھا۔ کہنے لگی "نہا لوں" میں نے کہا "اچھا" ٹھنڈے پانی سے نہائی۔ نہا کر اٹھی تو پسلی میں درد تھا۔ پھر بخار چڑھا جب سے یوں ہی بے سُرت پڑی ہے"۔

ساجدہ "آپ نے کچھ دوا وغیرہ پلائی"؟

بڑھیا ....

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر آ گیا۔ پردہ ہوا۔ دیکھا۔ نسخہ لکھا۔ دوا آئی اور اپنے سامنے دو دو گھنٹے بعد ساجدہ نے دو خوراکیں پلائیں۔ چلتے وقت دس روپیہ نقد دیئے اور کہا "میں صبح ہی پھر آؤں گی"۔

جس وقت ساجدہ اور زاہدہ ڈولی میں بیٹھنے لگیں تو بڑھیا پاس کھڑی تھی۔ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر زبان نہ اٹھتی تھی۔ آنسوؤں کا ایک تار تھا جو ساجدہ کی عنایت کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ شام کو سب سے پہلے چار آدمیوں کا کھانا سیر بھر دودھ اور تین لحاف بڑھیا کو بھیجے۔ دوسرے روز جب ساجدہ گئی ہے تو بیمار کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہفتہ بھر تک برابر دوا جاری رہی اور لڑکی تندرست ہو گئی۔ بڑھیا نے ساجدہ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اس کی ماں سے جا کر جو کچھ کہا اس کا اثر اتنا ہوا کہ اس نے فوراً بیٹی کو یہ خط لکھا :-

"ساجدہ بیٹی کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔ آج نیم والی بڑی بی آئی تھیں جس طرح انہوں نے تمہاری تعریفیں میرے سامنے کیں اور جس دل سے دعائیں دی تھیں۔ میں تمہارے سامنے بیان نہیں کر سکتی۔ کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ انسانیت کے یہی معنی ہیں اور دولت کی یہی تعریف ہے کہ حاجتمندوں کے کام آئے اور مفلسوں کو مدد دے۔ زندگی اسی کا نام ہے اور اسلام اسی کو کہتے ہیں۔ کہ انسان ہر رنگ میں اور ہر حال میں موت سے غافل اور انقلاب سے بے خبر نہ ہو۔ تم گئیں تمہارا جانا معمولی بات تھی۔ مگر نہیں تم نے ایک دل فتح کیا۔ ایک مسلمان کے کام آئیں۔ تم نے ایک حج کیا۔ ایک گرتے ہوئے مکان اور ایک اجڑے ہوئے دل کو تعمیر کیا۔ آباد کیا۔ تم نے دنیا

نہ دیکھا ہو لیکن تمہارے ہر قدم پر تمہارے ہر سانس پر ایمان کے
فرشتے مرحبا کے نعرے لگاتے تھے ۔ تم نے ایک فرض تم نے
ایک امانت اس کو دی اس کے پاس رکھوا دی جو سچا مہاجن اور
پورا امین ہے اور جس وقت ہر متنفس نفسی نفسی پکار رہا ہو گا تمہاری
یہ خدمت تمہاری یہ امانت تم کو واپس ملے گی ۔ تم بڑھیا سے بہت
زیادہ حاجتمند ہو گی ۔ بیمار سے بہت بڑھ کر مضطرب ہو گی ۔
یہاں تین عورتیں ایک گھر میں تھیں ۔ وہاں سب ہوں گے اور
کوئی نہ ہو گا ۔ مجھ جیسی ماں جو صورت کی عاشق زار ہے ۔ منہ پھیرے
گی اور ساجد جیسا باپ جو مرتے مرتے گلے لگا تا رہا آنکھ اٹھا کر
بھی نہ دیکھے گا ۔

پیاری بیٹی تمہاری ہستی کیا تھی ۔ اس احکم الحاکمین نے اپنی قدرت
سے اپنی عنایت سے تم کو دولت دی ۔ بیگم بنایا ۔ کیوں اس لئے
کہ دولت دے کر دیکھے ۔ اور حکومت دے کر آزمائے ۔ جو کر رہی
ہو اس میں فرق نہ آئے اور جو سمجھ رہی ہو اس میں کمی نہ ہو ۔ زندگی
کے ساتھ موت صحت کے ساتھ علالت، تموّل کے ساتھ عسرت
لازمی اور یقینی ہے کوئی فعل ایسا نہ ہو جائے کہ بعد میں پچھتاؤ ۔
سُنتی ہوں کہ نماز گنڈے دار ہو گئی ۔ خدا کی قسم ساجدہ کا بہت رنج
ہوا میرے دودھ کو یہ آگ لگی کہ مسلمان کی بچّی ۔ ہٹی کٹّی موٹی تازی
اذان سُنے اور پان کھائے ۔ یہ عزّت ہمیشہ یہ دولت سدا اور یہ
زندگی زیادہ دیر رہنے والی نہیں ۔ موت سر پر موجود ہے اور پہنچنا
ہے اس گھر میں جہاں عزیز اور غیر کوئی بھی کام نہ آئے گا ۔ اندھیرا

گھُپ ہوگا۔ سانپ بچھو۔ کیڑے۔ کھنکھجورے اس جسم کو جو آج
خدا کے سامنے جھکتے ہوئے ہچکچاتا ہے چھلنی کر دیں گے۔ وہاں پہ
نماز ہی ایسی چیز ہو گی جو اندھیرے کو اُجالا اور قبر کو روشن کر دیگی۔
دنیا کے بہت سے مرحلے دیکھ لئے کوارپنے سے دُلہن بنیں۔ بیوی سے
ماں بنیں۔ لڑکی سے گھر والی بنیں۔ لیکن ابھی کچھ اور بننا ہے اور
وہ سب سے پیچیدہ اور سب سے نازک مسئلہ ہے۔ ساجدہ
اس وقت کو نہ بھُول اور تیار رہ ہر وقت اس امتحان کے۔ اس
جواب کے۔ اس عذاب کے واسطے جو موت کے ساتھ ہی شروع
ہو جائے گا"۔

پانچواں باب

ضمیر شاہدہ کی پرورش میں دن رات منہمک تھا اس نے اپنی دانست میں
اپنی بساط کے لائق اور اپنی حیثیت کے موافق کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کھلانے
کے واسطے نرس۔ پڑھانے کے واسطے مس۔ مشن میں تعلیم اس نے ولائی میموں
کی صحبت میں اس نے رکھا۔ مختصر یہ کہ صبح سے شام تک صرف تعلیم کی کوشش اور
اصلاح کا خبط تھا۔ ماں سے اس کا واسطہ ہمیشہ ہی برائے نام رہا۔ ہشیار ہوئی
تو بس اتنا تعلق ضرور تھا کہ مدرسہ جاتی دفعہ اور آتی دفعہ کھڑے کھڑے دو چار
باتیں۔ ورنہ ایک علیحدہ کمرہ جو باپ نے اس کو دے دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ
بلا اجازت کوئی نہ جانے پائے۔ رات بھر اس میں رہتا اور جو جی میں آئے وہ پڑھتا۔
برخلاف اس کے زاھدہ ماں کی دوسری تصویر تھی۔ غرض ایک بیٹی باپ کی اور ایک ماں کی۔

یہ ضمیر کی کھلی ہوئی زیادتی اور علانیہ حق تلفی تھی کہ چھوٹی پر اشرفیاں اٹھاتا اور اُف نہ کرتا۔ اور بڑی کو چھوٹی کوڑی نہ دیتا اور ہر وقت جلتا۔ اس کی عادت اس کی خصلت اس کی باتیں اس کی صورت ہر چیز ظالم کو زہر معلوم ہوتی تھی۔ شاہدہ کے ساتھ ساجدہ کا یہ سلوک نہ تھا اس کو دونوں آنکھیں ایک تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ جو چاہے کھا سکتی اور منگوا سکتی ہے۔ لیکن جب اس نے کسی چیز کا حصہ کیا تو وہی شرعی آدھا اس کو آدھا اس کو۔

زاہدہ چودھویں اور شاہدہ تیرھویں برس میں تھی کہ ایک روز شاہدہ کو اپنے کمرہ میں ڈر لگا۔ سوتے سوتے کچھ ایسی ہیبت بیٹھی کہ گھگھی بندھ گئی۔ کمرہ اکیلا تھا ما اتفاق سے جاگ رہی تھی۔ اٹھی گئی دیکھا تو واقعی بچی تھر تھر کانپ رہی ہے ہشیار کیا تو جاگی۔ مگر ڈر کچھ ایسا بیٹھا تھا کہ بات نہ کر سکتی تھی۔ میاں کو بلایا تو اس نے کہا سینہ پر ہاتھ پڑ گیا ہوگا۔ دوسری کروٹ سے سُلادو"۔

بیوی:۔ "میں تو اب اس اکیلے کمرے میں نہ سونے دوں گی۔ اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو کیا ہوتا وہاں لے جا کر سُلاؤں گی یا آپ یہاں سوؤں گی"۔

میاں:۔ "نہ تمہارے یہاں سونے کی ضرورت نہ اس کے وہاں جانے کی۔ بس تم جاؤ سوؤ"۔

بیوی:۔ "اچھا بیٹی تو آیت الکرسی پڑھ لے۔ مگر ہاں تجھے آتی ہی کہاں ہے"؟

میاں:۔ "ایسی ہی کرسی کی ضرورت ہے تو میں کرسی لا دوں۔ وہ رکھدو"۔

بیوی:۔ "توبہ توبہ تمہارے ایمان کو کیا ہوگیا"۔

ضمیر باہر چلا گیا شاہدہ سوگئی۔ ساجدہ آکر لیٹی تو سب سے پہلے اس کو میاں کی اس کرسی کا خیال آیا کہ ان کے ایمان کو کیا ہوگیا۔ آیت الکرسی کا ایسا مضحکہ توبہ کیا کروں کس طرح اصلاح کروں کسی طرح خدا یاد نہیں آتا۔ اس کے بعد بیٹی کی گمراہی

کا جھگڑا بندھا کہ مسلمان کی بچی درود شریف اور کلمے سے واقف نہ ہو۔ اس کا عذاب تو مجھ پر پڑے گا۔ اور سب باتوں کو جانے دو نماز بھی تو نہیں آتی۔ ہائے کیا ہو گیا اور کیا کروں گی۔ ان خیالات میں اس قدر محو ہوئی کہ نیند صاف اڑ گئی ہر چند چاہا کہ کسی طرح سوؤں۔ مگر کسی کروٹ چین نہ پڑتا تھا۔ اٹھی چپکے سے کمرے میں گئی۔ اسکے سرہانے کھڑی ہوئی آہستہ آہستہ آیت الکرسی پڑھی اور حصار باندھ کر چلی آئی۔

دونوں بہنوں کی جس طرح تربیت میں بعد المشرقین تھا اسی طرح خیالات میں بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چھوٹی نہ صرف بڑی کو جاہل۔ پھوہڑ بے وقوف اور ناکارہ سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بات کرنی بھی کچھ کسر شان سی سمجھتی تھی۔ یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ زاہدہ شاہدہ کے کمرے میں گئی ہو۔ ہاں کئی دفعہ ہوا کہ کسی ضرورت سے یا محبت سے کوئی بات اس نے بہن سے کی اور وہ جھٹ سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ زاہدہ کو ناگوار تو ہوتا۔ مگر نہ اتنا کہ دل میں بل بھر کر بیٹھ جائے لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر زاہدہ ایک دفعہ بھی ایسا کرتی اور بہن کی بات کا جواب نہ دیتی تو شاہدہ وہ کٹر لڑکی اور کینہ ور بچی تھی کہ شاید عمر بھر بہن کی صورت نہ دیکھتی۔

ایک پیٹ کی دو بچیاں اور ایک باپ کی دو لڑکیاں۔ ایک گوشت ایک پوست مگر تربیت کے متفرق اثرات نے دونوں کے خیالات میں اتنا کچھ فرق کر دیا کہ ایک مشرق میں تھی تو ایک مغرب میں۔ زاہدہ مؤذن کی اذان کے ساتھ اٹھتی۔ باوجود ایک چھوڑ دو دو ماماؤں کے اگر کسی کی آنکھ نہ کھلتی تو اپنے ہاتھ سے پانی گرم کر لیتی گرمی ہوتی تو خود ہی ٹھلیا بھر سے پہلے نہاتی۔ اس کے بعد نماز پڑھتی اور کلام اللہ میں مصروف ہو جاتی۔ اس سے فارغ ہو کر خود کمروں میں جھاڑو دیتی یا اپنے سامنے دلواتی اور پھر باورچی خانہ میں جا پہنچتی اور ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ شاہدہ صبح آٹھ بجے سو کر اٹھتی اور بچھونوں میں لیٹے لیٹے چائے بسکٹ کھاتی۔ جب ناشتہ

ہوجاتا ۔ تو اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوتی ۔ کنگھی چوٹی کرتی اور ریشن کی کتاب رٹنی شروع کردیتی ۔ دس بجے کے قریب مدرسہ چلی جاتی ۔ بارہ مہینے کی بیماری اس کے پیچھے ایسی لگی کہ کوئی دن بغیر شکایت کے بسر نہ ہوتا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محنت کرتی نہ مشقت۔ گھر کے کام کاج سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

شاہدہ کی بیماری سے ماں اور باپ دونوں پریشان رہتے تھے ساجدہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو اُتنا دبڑ گئی وہ اچھی نہیں ۔ بھلا کوار پنے کی عمر بے فکری زمانہ آزادی کے دن ۔ اس وقت بیماری کیسی ۔ اگر اب بھی بڑی کی طرح چلنے پھرنے لگے تو چار دن میں تھوڑا سی دوڑے گرمیاں کی وجہ سے ہوں نہ کرسکتی تھی ۔

چھٹا باب

اب تک تو ساجدہ کو شاہدہ کی تربیت کا رونا رہا ۔ مگر اب خدا نے دو لڑکیوں کے ساتھ ایک بیٹے کی ماں بھی بنادیا ۔ لڑکے کی پیدائش سے ضمیر کو جس قدر خوشی ہوئی وہ بیان نہیں ہوسکتی ۔ چھ دن اور رات دوستوں کے جلسے رہے ۔ ناچ ہوا ۔ گانا ہوا ڈنر ہوا ۔ پارٹیاں ہوئیں جس روز ساجدہ چھٹی نہائی ہے ۔ اس روز بچہ کا عقیقہ تھا اور اس نے تمام رشتہ دار عورتوں کیسا تھ ضمیر کی چچازاد بہن اپنی نند کو بھی بلایا تھا ۔ مہمان جمع ہوگئے تو عقیقہ ہوا ۔ اس کے بعد ساجدہ نے نند سے کہا کہ آؤ بوا منہ دُھلاؤ ۔ اور بچہ کو اپنا کرتہ ٹوپی پہنا کر منہ میں دودھ دو ۔ شاہدہ پاس کھڑی تھی ۔ ماں کا یہ فقرہ سُنکر مسکرائی اور جب پھوپھی نے اپنا کُرتہ ٹوپی پہنا کر یہ رسم ادا کی تو ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگی ۔ ساجدہ کو ناگوار تو بہت ہوا ۔ مگر اس وقت سب کے سامنے کچھ نہ بولی ۔ جب عقیقہ ختم ہوا ۔ اور لوگ چلے گئے ۔ ضمیر اندر آیا تو ماں کے سامنے ہی شاہدہ نے باپ سے کہا ۔

"بابا آپ نے دُودھ دُھلائی کی رسم نہ دیکھی - نہایت پُر لطف تھی - اما جان کا دُودھ دُودھ سے دھویا گیا اور پھوپھی جان کو اس کے بدلے روپے دئے گئے وہ چھکے سے لیکر چلتی ہوئیں - کرنہ ٹوپی زیادہ سے زیادہ پانچ چھ روپے کا ہوگا - مگر جو کچھ ان کو ملا وہ اس سے بہت زیادہ تھا - یہ بھی بہت اچھی تجارت ہے - وہ کہتی ہوں گی کہ روز بیٹے ہوا کریں"۔

ضمیر :- "بیگم تمہاری تو ہر حرکت میں مصلحت ہوتی ہے - ہمیں بھی تو بتاؤ آخر اس تجارت میں کیا منفعت تھی"؟

ساجدہ میاں کے سوال کا کچھ جواب دینے نہ پائی تھی کہ شاہدہ نے کہا "اُس کی منفعت میں آپ کو بتا دوں - دودھوں نہائے پوتوں پھلے"۔

ضمیر :- (ہنس کر) "ہاں بیٹی ہاں - دودھ سے تو اسی لئے دودھ دھویا ہوگا - مگر پوتوں پھلے کیوں ہوا"۔

شاہدہ :- "وہ اسکے آگے محذوف ہے - دودھ ہی سے پوت بھی ہو جاتا ہے واہ بی اما جان - زمانہ اتنی ترقی کر گیا مگر تماشا ہے کہ آپ کے کان پر جوں نہیں چلتی - یہ رسوم جنہوں نے ہمارا خاتمہ کر دیا - افسوس اب تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں - جو روپیہ آپ نے ان کو دیا اگر وہ کسی قومی کام میں صرف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا"۔

ساجدہ کا چہرہ غصہ کے مارے سُرخ تھا - ایک رنگ آرہا تھا - اور ایک جا رہا تھا - مگر بالکل خاموش تھی - ضمیر بیوی کا یہ حال دیکھ کر اور بھی چھیڑنے لگا - اور پھر کہا "ہاں بیگم مصلحت نہ بتائی"؟

ساجدہ :- "میں خاموش ہوں - اور اس گستاخ کے مُنہ لگنا نہیں چاہتی - تم اپنے ساتھ اس کو بھی شہ دے کر شیر کرتے ہو"!

شاہدہ:۔ نہیں اماجان یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میرے کان میں آواز پڑی رہی تو اچھی بات ہے۔

ساجدہ:۔ تمہارا اعتراض لغو۔ تمہارا مضحکہ غلط۔ تمہاری رائے جھوٹی تمہاری عقل خبط۔ تم جس پر ہنس رہی ہو یہ انسانیت کا وہ جوہر ہے جس کی تہ میں چمکتے ہوئے موتی دمک رہے ہیں۔ تم نے دو چار زبانوں سے رسوم کی قباحت سُن لی اور رٹ لی لیکن اصلیت کو نہ سمجھے۔ کاش خدا تم کو عقل دیتا تو اعتراض سے پیشتر اور ہنسنے سے پہلے سوچتے اور سمجھتے کہ کیا کیا اور کیوں کیا۔ سنو اور سوچو۔ سمجھو اور غور کرو۔ آج چھ روز سے سینکڑوں روپیہ لغویات اور خرافات میں صرف ہو رہا ہے۔ لیکن ایک پیسہ ایک کوڑی۔ ایک وقت کا کھانا کسی ایسے شخص کو نہ دیا گیا جو مستحق تھا۔ تمہارے یا تمہارے باپ کے دل میں سینکڑوں ارمان ہزاروں خوشیاں لاکھوں اُمنگیں پیدا ہوئیں۔ لیکن کبھی اس زبردست ہستی کی طاقت کا اندیشہ نہ پیدا ہوا جو آناً فاناً کھلے ہوئے پھول مہکتے ہوئے پودے اور چہکتے ہوئے نغمے اُجاڑ سکتی ہے۔

جو کچھ ہم کو میسر ہوا اسی خدائے برحق کی عنایت اور رحمت سے' ہمارا فرض تھا اور جب تک زندہ ہیں رہے گا۔ کہ ہر وقت ہر ساعت ہر لمحہ اپنی گردنیں اس کے حضور میں جھکائیں اور اس نعمت سے جو ہم کو دیتا ہے اور دے رہا ہے اس کو بھی دیں تاکہ ہمارے کاموں میں ترقی ہماری مسرتوں میں اضافہ اور ہماری راحتوں میں برکت ہو۔ ہماری زندگیاں خالی خولی نہیں۔ ہر طرف سے فرائض اور حقوق میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ہمارا کام کھانا۔ پیتا ہنسنا اور بولنا ہی نہیں فرائض کی ادائگی اور حقوق کی نگہداشت بھی ہے۔ ہم پر بہت سے حقوق ہیں۔ عزیزوں کے پڑوسیوں کے۔ نوکروں چاکروں کے۔ غریب غربا کے۔ اور اُن کے جو عزت میں شرافت میں ہم سے کم نہیں مگر دولت اور ثروت میں ہمارے محتاج اور دست نگر ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے

کہ ہمارے دسترخوان پر قورمے اور بریانی ہوں لیکن ہمارے عزیز فاقوں سے بھوکے سو رہے ہیں؟ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے جسم پر دیبا و حریر ہوں اور ہمارے پیارے پیوند لگائیں اور ننگے پھریں؟

تم کو رسموں پر اعتراض ہے۔ تم کس منہ سے بڑا کہتی ہو۔ تم تو اس سے بھی بدتر کام کر رہی ہو۔ رسوم کی قباحت اس اعتبار سے درست کہ روپیہ برباد نہ ہو۔ مگر تم نے تو رات دن گلچھرے اڑائے۔ کون سے طائفے تھے جو اس تقریب میں نہ آئے۔ کیا اس میں سے کچھ روپیہ خدا کی راہ پر نہ اٹھ سکتا تھا؟

رسوم بیشک قابل اصلاح ہیں۔ مگر ان کنکروں میں جواہر ریزے ان گدڑیوں میں لال اور اس سیاہی میں سفیدی بھی ہے۔ تم کو معلوم ہے ہماری کتاب مقدس ہم کو کیا حکم دیتی ہے ذِی الْقُربیٰ سے پہلے ہم پر ہمارے عزیزوں کے حقوق ہیں۔ اور ہماری حالت یقیناً خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس قابل ہے کہ ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ سلوک کریں۔ اور ان کی ضرورتوں پر کام آئیں۔ میں نے کبھی دفعتاً اس طرف متوجہ کیا۔ مگر تم نے پرواہ نہ کی۔ میرا ایمان ہے کہ جس طرح نجاست کا ایک قطرہ پانی کے بھرے ہوئے گھڑے کو ناپاک کر دیتا ہے اسی طرح عطر کی ایک بوند غلیظ گھڑے کو بھی مہکا دیتی ہے۔ اس تمام روپیہ میں جو صرف ہوا اگر خدا قبول کر لے تو وہی ایک رقم جو میں نے تمہاری پھوپھی کو دی، اس قابل ہے کہ تمام اسراف کو پاک کر دے۔

یہ رسم جس کا تم نے مضحکہ اڑایا۔ ہنسنے کے قابل نہیں۔ وہ کس شوق اور محبت سے کرتہ ٹوپی لائیں۔ میرے اس سے بہت زیادہ قیمتی کپڑے موجود تھے لیکن میرا کام یہ تھا کہ ان کا دل نہ توڑتی۔ اسی لئے میں نے بچہ کو اپنے کپڑے نہ پہنائے اور ان کا دل بڑھا دیا۔

کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ دودھ کی مالش سے زچہ کا دودھ بڑھتا ہے۔ طب کی کتابیں دیکھو۔ اپنی لیڈی ڈاکٹر سے پوچھو۔ میں پڑھ بھی چکی ہوں اور پوچھ بھی۔ اس فعل کو طب کے اعتبار سے نہایت مفید ہے۔ اگر اس صورت میں ڈھال دیا تو کیا خرابی کی۔ تم کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ مگر مجھے خبر ہے کہ سلیمہ جس کے نیگ پر تم کو اعتراض ہے نہایت بدنصیب عورت ہے۔ بیوہ ہے دو بچے ہیں اور ایک بڑھیا ماں اس کا حق یقیناً تمہاری کمائی میں ہے اور میں نے جو کچھ اس کو دیا ہرگز ہرگز اس پر احسان نہیں بلکہ تم پر ہے کہ میں نے مواخذہ عاقبت سے بچایا۔"

ساتواں باب

کہنے کو اور کہنے کو کیا حقیقتاً دونوں بچوں کے نکاح کا مختار باپ تھا اور گو وہ ایک کا عاشق زار اور ایک سے قطعاً بیزار۔ شروع ہی سے تھا پھر بھی اُمید یہ تھی اور ایک دو کو نہیں سب کو کہ شادی کے معاملہ میں وہ جو کچھ کریگا دیکھ بھال کر اور سمجھ بوجھ کر۔ لاکھ ناخوش اور علیحدہ سہی۔ مگر اپنی اولاد تھی۔ اور بدنصیب باپ کے گھر میں چند روز کی مہمان مناسب تھا دستور دنیا کے موافق اور حکم خدا کے موافق کہ کمبخت زیادہ نہیں اتنا اور بہت نہیں اس قدر سمجھ لیتا کہ کوارپنہ ہمیشہ رہنے والا اور زاهد سدا ٹھہرنے والی نہیں۔ یہ ساون کی چڑیا۔ برسات کا چھینٹا۔ صبح کی چاندنی اور ریت کی چمک ہے۔ وقت آرہا ہے کہ یہ اس گھر کو ترسیگی۔ اور میں نہیں تو میرے گھر کا کونہ کونہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت کو دیکھے گا۔ اور نظر نہ آئے گی۔ میں کہاں اور یہ کہاں۔ یہ بھی وقت کی بات اور محض اتفاق ہے کہ میرے غصے کی نظریں اور تیوری کے بل دیکھ رہی ہے۔ اور سہہ رہی ہے۔ مگر سمجھتا تو اس وقت جب دماغ صحیح اور عقل درست ہوتی۔ خیر اس کا بھی مضائقہ نہیں اس دنیا اور اس جہان میں عقل مند بھی جیتے ہیں۔ بیوقوف بھی

ہشیار بھی رہتے ہیں۔ مریل بھی۔ مگر کمبخت تو بیوقوف اور بیہودہ ہوکر ہمیشہ اور ہر حال میں اپنے تئیں عقلمند اور لائق سمجھتا تھا اس کو شاہدہ کی محبت تھی۔ اور معمولی نہیں بہت زیادہ۔ مگر اس میں بھی صداقت نہ تھی وہ صرف اس توقع پر اس کا فریفتہ تھا کہ یہ میری مرضی کے موافق اور خواہش کے بموجب تہذیب کا مخزن اور شہرت کا معدن ہو گی۔ بہرحال کیفیت یہ تھی کہ ایک آنکھ میں لہر بہر ایک آنکھ میں خدا کا قہر۔ شاہدہ علی الاعلان کھلے خزانے جو چاہتی وہ کرتی۔ جو جی میں آتا کہتی۔ مگر وہ اُف نہ کرتا۔ جب رئیس البیت ہی بھلی اور بُری سب دیکھتا اور جائز سمجھتا تو ناجائز سمجھنے کا حق کس کو اور ٹوکنے والا کون؟ شاہدہ جو کچھ بھی کرتی کم تھا پردے کی پروا اسے نہ تھی بزرگوں کا ادب اسے نہ تھا۔ اور پھر لطف یہ کہ ماں سے لے کر بہن تک اور بڑے سے لیکر چھوٹے تک سارے گھر کو جاہل اور دقیانوسی سمجھتی۔ تعلیم۔ تربیت صحبت کچھی تین چیزیں تھیں جنہوں نے اس کو مغربی سانچے میں ڈھالا ان پر طرّہ باپ کی داد تھی۔ کہ ہر قول کو اور ہر فعل کو سر پر رکھتا اور آنکھوں سے لگاتا وہ ماں کے منہ در منہ اور بہن کے سامنے ڈنکے کی چوٹ دونوں کو جاہل ناقص اور بیوقوف کہتی۔ ماں غریب کے فرشتوں نے بھی اس ڈھنگ کی لڑکی دیکھی نہ سنی۔ جلتی بھلتی انگاروں پر لوٹتی اور آگ میں بھنتی۔ مگر جانتی تھی کہ سمجھانا بجھانا تو درکنار آدھی بات بھی زبان سے نکالوں گی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ ایک کہو دس نہ چار سنوں ہم اس معاملہ میں قطعاً ساجدہ کو ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے دور نہ سمجھتے ہیں۔ آخر زاہدہ بھی تو اسی کی بچی تھی۔ اسی گود سے اُٹھی اسی دودھ سے پلی مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق اور مشرق و مغرب کا بُعد تھا۔ تمام ذمہ داری از ابتدا تا انتہا اسی بدنصیب باپ پر ہے جس نے غیروں کی طرح آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیا کانوں میں تیل ڈالا کہ رتی بھر پرواہ نہ کی۔ جوان قریب قریب تو ہو ہی چکی

تھیں۔ اب دونوں کا کوارپنہ ماں کے واسطے پوری مصیبت تھی۔ وہ لاکھ شاہدہ سے بے تعلق تھی۔ مگر ممتا کا کیا علاج کرتی۔ کہ صرف اس خیال نے کہ عمر ہیں ڈھل رہی ہیں اور بر نہیں جڑتے اس کو کھانا پینا سب حرام کر دیا۔ رات اسی چکر میں ختم اور دن اسی ادھیڑ بن میں پورا ہو جاتا۔ دو چار دفعہ میاں کو بھی متوجہ کیا مگر وہ بجائے اس کے کہ بیوی کے رنج میں شریک ہو کر یا کوئی اور معقول بات کہہ کر اس کو تسکین دیتا۔ جب بولا الٹا اور جو جواب دیا اوندھا۔ اور آخری فیصلہ یہ کیا۔ کہ "تم شاہدہ سے بے فکر رہو۔ اپنی بچی کا انتظام کرو اس کا بھی ہو جائیگا"۔ خدا کا شکر ہے روپیہ کی کمی نہ تھی۔ عزت بھی تھی اثر بھی تھا۔ ایک خرابی بی مخلا تی کی تھی۔ تو روپیہ کے آگے ہڈی کو کون پوچھتا ہے۔ دولت نے اچھی طرح چھپا دیا۔ بات نہ آنے یا شادی نہ ہونے کی وجہ اور تھی اور معقول تھی۔ بی شاہدہ کے گن چھپے ڈھکے اور میاں کے کرتوت ایسے ویسے نہ تھے۔ ایک دنیا میں شہرت اور ایک جہان میں ڈنکا بج چکا تھا۔ بیچارے اگلے زمانہ کے سیدھے سادے تو اس کا نام آتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ زمانہ نے اچھی طرح بتا اور وقت نے پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نشہ جدید کی متوالیاں تعلیم یافتہ بہیں اتنی شرابور اور ایسی چکنا چور ہیں کہ میاں کو لنگوٹی بندھوا کر بھی نہ چھوڑیں گی۔ یہ بارہ مہینے کی روگی۔ تیس دن کی بیمار۔ کام کی یہ نہیں۔ کاج کی یہ نہیں۔ رہے اس رنگ کے شیدا ان کی خواہشیں بڑھی ہوئی۔ تمنائیں پھیلی ہوئی۔ حسن کے متلاشی، دولت کے جویا تعلیم کے خواہاں سلیقہ کے آرزومند ان کو کیا غرض پڑی تھی کہ جب تک پورا مقابلہ نہ کر لیں اور دس پانچ کو نہ لیں۔ دو چار کو حقیر ایک آدھ کو جاہل نہ بنا دیں شادی پر آمادہ ہو جائیں۔ بی شاہدہ کا نام شہر میں پوری طرح روشن اور اچھی طرح اچھل چکا تھا۔ اور ابھی تک اپنے بڈھے کھڈے موجود تھے جو اتنی سی بات پر رشتہ واپس کر دیں کہ بھائی ہم کوٹ پتلون کی عزت کے قابل نہیں

اب ان کی کیفیت ہو سکتی تھی تو اپنے ہی رنگ میں۔ اب چاہے تو یہ سمجھو کہ ایک مچھلی نے سارا جل گندہ کیا، چاہے یہ کہ چنے کے ساتھ گھن بھی پسا۔ شاہدہ کے ساتھ زاہدہ پر بھی مصیبت آئی کہ اس کا بیاہ بھی اُڑ گیا۔ میاں کا جواب سُن اور زاہدہ کی کیفیت دیکھ چاہئے تھا کہ ماں خاموش ہو جاتی یا ان فکروں سے چھٹکارا پاتی جُوں جُوں دن بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کا سہم ترقی کر رہا تھا۔ حصن حصین کا ختم یا سمیع کا چلہ دونوں پورے کر لئے۔ مگر بات بڑی کی آئی نہ چھوٹی کی۔ بد نصیب کو ایک آدھ دفعہ نہیں دو چار دفعہ اور فقط اپنوں ہی سے نہیں غیروں تک سے منہ پھوڑ کر کہنا پڑا کہ بچیوں کا خیال رکھنا۔ مگر شاہدہ کچھ ایسی بدنام ہو چکی تھی کہ کوئی حامی ہی نہ بھرتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ رحیمن شاہدہ کی داروغہ، حساب کتاب کی مختار، سالن گرم کرنے آگ کی بھری انگیٹھی لئے آ رہی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ چوکھٹ پر چڑھتی تھی کہ پاؤں رپٹا اور دھڑام سے گری۔ سفید چادر، لال غالیچے، ریشمی پردے، سب بھرتہ ہوتے۔ کہنیوں تک دونوں ہاتھ، منہ، ٹھوڑی کے سب کی چربی نکل آئی۔ جیسا بڑھیا تو نہ تھی۔ مگر پچاس کا پیٹا ضرور تھا۔ خاصی شریف خاندان کی عورت اور ایک اوسط درجہ کے شوہر کی بیوی تھی۔ مگر پے در پے موتیں اور متواتر مصیبتیں کچھ ایسی آکر پڑیں کہ پلنگ پر دری تک نہ رہی۔ ایک کڑیل بیٹا مرا۔ ایک جوان بیٹی گئی۔ سا زندہ تھی وہ پھونس۔ بھائی موجود تھا وہ دیوانہ۔ چار ساڑھے چار برس سے یہاں کام کر رہی تھی۔ کل کا دن یا سکھ کی رات تو ایک گزرانہ گزری ہر وقت کل کل اور پٹ پٹ تھی۔ الو گدھی بات بات میں چوربے ایمان مگر پیٹ بُری بلا ہے۔ اُٹھاتی جو پڑتی اور کھٹکتی جاتی۔ شاہدہ کے دربار میں اتنا بڑا واقعہ اتنا سنگین جرم اتنا عظیم قصور مصیبت تھی آفت تھی۔ قیامت تھی۔ بڑھیا جو ایک آدھ دفعہ پٹ بھی چکی تھی آج موت کا یقین کر بیٹھی۔ آگ تو خیر دوسری ماماؤں نے آکر بجھائی مگر شاہدہ کو صبر کہاں۔ اٹھی جو منہ میں آیا کہا اور سُنایا۔ مگر یہ کافی نہ تھا۔ ایک لات ایسی ماری

کہ انگیٹھی پر جا کر گری اور جھلسے ہوئے چہرے سے خون نکلنے لگا۔ اس وقت تو بات گئی گذری ہوئی۔ مگر رات کو اپنے گھر پہنچی تو پلنا دو بھر تھا۔ بی شاہدہ کو جب یہ معلوم ہوا تھا کہ کھانا دیوا سنے بھائی کو کھلاتی ہے۔ تو یہ اہتمام کیا تھا کہ یہیں سے کھا پی خالی ہاتھ جائے۔ یہاں سے جا کر دیوانے بھائی کا کھانا پکاتی۔ آج گئی تو بدن چور تھا۔ اور آگ میں جل رہی تھی۔ مگر اسی حالت میں گرتی پڑتی اٹھی آٹا گوندھا روٹی پکائی کھلا چکی تو لیٹی مگر نیند کہاں ساری رات یہ معلوم ہوا کہ انگاروں پر لوٹ رہی ہے صبح حکیم کے ہاں گئی نسخہ لکھوایا۔ پیسہ پاس نہ تھا۔ تین مہینے کی تنخواہ شاہدہ پر چڑھی ہوئی تھی۔ سوچا کہ تنخواہ لے آؤں اور علاج شروع کروں۔

. . . . یہاں آئی تو بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ بڑی مشکل سے ڈولی میں بیٹھ ہائے ہائے کرتی آئی۔ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ شاہدہ صورت دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور چبوترے سے نیچے اتر کر کہنے لگی۔

"یہ فیلسوفی کس بات کی ہے تو کس کے حکم سے آج غیر حاضر ہوئی"؟

رحیما۔ "آپ میری حالت دیکھتے ہیں کام کے قابل ہوں"۔

شاہدہ۔ "حالت میں کیا ہے۔ اگر کام کے قابل تو نہیں ہے۔ تو اپنا عیوض دیا ہوتا"۔

رحیما۔ "میں بیگم کس کو لاؤں"؟

شاہدہ۔ "آہستہ بات کر گستاخ بدتمیز"۔

رحیما۔ "میری تنخواہ دے دیجئے تو دوائی ٹھنڈائی کروں"۔

شاہدہ۔ "تنخواہ ضرور ضرور یاد رکھو۔ ہرگز تنخواہ نہیں مل سکتی۔ کام کرو اس کے بعد تنخواہ مانگو"۔

رحیما۔ "بیگم میں تو مر رہی ہوں کام کیا خاک کروں گی"۔

شاہدہ۔ "پھر گستاخی کی بات۔ اُلّو کا موافق بات مت کرو۔ نکل جاؤ"۔

رحیما۔ "بیگم میری تنخواہ دے دو ہیں چلی جاؤں"۔

شاہدہ۔ "بکو مت پہلے عوض حاضر کرو۔ اس کے بعد تنخواہ کا درخواست کرو۔ جتنا نقصان ہوا وہ سب کاٹا جائے گا"۔

رحیما۔ "آپ ایک کوڑی نہ دیجئے۔ میں عوض کہاں سے لاؤں"۔

شاہدہ۔ "تمہارا بھتیجی موجود ہے۔ اس کو بھیجو وہ کام کرے گا۔ تم ہرگز نہیں جانے سکتا جب تک وہ نہ آئے"۔

رحیما۔ "بیوی میں تو بڑھیا تھی۔ برقع سر پر ڈال لیا۔ سیانی بچی کو کیسے باہر نکال دوں۔ مجھ پر تو پڑی تھی نوکری کر لی۔ اس کو کیا غرض جو وہ نکلے"۔

شاہدہ۔ "وہ نہیں نکلے! کیوں نہیں؟"

رحیما۔ "بیوی عزت بھی آخر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ آخر میں تو اسے بچہا ہے کیسے باہر نکال دیں"۔

شاہدہ۔ "تم عزت دار ہے۔ اُلّو اچھا تم کو عزت دے گا۔ تم مت لاؤ اسکو"۔

رحیما۔ "بیوی ذرا تو زبان سنبھال کر بولو۔ میری جان نکل رہی ہے آپ تنخواہ دیتی ہیں دیں نہیں تو میں چلی جاتی ہوں"۔

شاہدہ۔ "چپ رہو اُلّو۔ تم نہیں جاسکتا۔ ہم ابھی تمہارا علاج کرتا ہے"۔

رحیما بدنصیب کو تنخواہ کا ملنا تو درکنار خالی جانا بھی امرت ہوگیا۔ ارادہ کیا تو شاہدہ نے زبردستی پکڑ کر بٹھا لیا اور حکم دیا کہ بلا اجازت یہاں سے سرکی تو سخت سزا ملیگی۔ ادہر اس کو بٹھایا اُدہر آدمی کو بھیج بھتیجی کو بلا بھیجا کہ رحیما بلا رہی ہے۔ منیرا آئی تو اس کی صورت دیکھتے ہی رحیما بیتاب ہوگئی اور کہنے لگی تو کیوں آئی۔

منیرا۔ "تم ہی نے تو بلایا ہے۔ آدمی گیا تھا"۔

رحیماً: "بڑی بیگم آپ ہی للہ فیصلہ کیجئے۔ بھلا کسی کی کواری بچی کو اس طرح
بلا لینا اچھی بات ہے۔ ہم غریب سہی۔ فقیر سہی۔ مگر اپنی عزت تو رکھتے ہیں۔ ہاتھ
بیچا ہے ذات تھوڑی بیچی ہے۔ دیکھئے تو سہی۔ منیراؔ کو بلا لیا!"

شاہدہ: "کمینے کی بچی عزت دار کی جورو چپ رہو۔ ہم تنخواہ دیں گے
مفت کام نہیں لیں گے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم مرتا ہے تو اپنا عوض دو۔ تمہاری
موت ہم کو تکلیف نہیں دے سکتی۔"

یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا۔ اس کے بعد شاہدہ کا غصہ اور تیز ہوا اس نے
فوراً رحیماً کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بخار میں ہل رہی تھی۔ چوٹ میں
مر رہی تھی۔ مگر اپنی بیماری اور موت دونوں بھول گئی۔ چلنے لگی تو بچی کا ہاتھ
پکڑا مگر پیچھے سے ایک اس زور کا دوہتڑ پڑا آنکھیں کھل گئیں۔
"کمینے کی بچی یہ نہیں جا سکتی جب تک دوسرے آدمی کا انتظام نہ ہو جائے۔"

رحیماً: "بیگم ذرا انصاف تو کیجئے میں کس طرح سیانی بچی کو آنکھ سے
اوجھل کر دوں۔"

شاہدہ: "نہیں نکل جاؤ۔ ابھی نکلو۔ ہم دوسرے آدمی کا انتظام کرتے
ہیں جس وقت آگیا اسی وقت اس کو نکال باہر کریں گے۔ جاؤ باہر جاؤ نکلو نکلو
ابھی چلو چلو فوراً غارت ہو بڑھو آگے بڑھو۔"

رحیماً روتی ہوئی باہر نکلی۔ اس خیال سے کہ شاید میاں کچھ تصفیہ کریں۔
اس کے پاس مردانے میں پہونچی۔ مگر وہ جیسے ماں بھی تو شاہدہ کا باپ تھا۔ ساری
کتھا سن چکا تو کہنے لگا "بس صاحب کے انتظام میں ہم کو دخل کی ضرورت نہیں"۔

مایوس ہو کر پھر گھر میں آئی تو شاہدہ نے دوسری عورت کو بلا کر کہہ دیا تھا
منیراؔ کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور جب تک ہم حکم دیں اپنے پاس رکھو۔ حکم کی تعمیل میں کیا دیر۔

ہو سکتی تھی۔ منیرا حمیدہ کے ساتھ روتی ہوئی جا چکی تھی۔ چاروں طرف دیکھا ہر ایک سے پوچھا کہتی سُنتی پھری روتی گڑگڑاتی پھری مگر کس کی مجال تھی کہ شاہدہ کے معاملہ میں دم مار سکتا۔ یہ گرمی کا پہاڑ سا دن کیسی دوائی اور کس کی ٹھنڈائی پانی کے دو گھونٹ بھی نصیب نہ ہوئے۔ زاہدہ اور ماں دونوں شاہدہ کا ظلم دیکھ بھی رہے تھے اور رحیما کی بے گناہی پر کلیجہ بھی کٹ رہا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ شاہدہ سے تو کیا رحیما سے بھی بات کر لیتے۔ شام کے وقت زاہدہ اور ماں عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو شاہدہ تہا دھو کر کلب کے واسطے کپڑے بدل باہر آئی۔ ہاتھ میں ٹینس کا بلا تھا۔ رحیما کو حکم دیکر کہا:۔

"تم مکار لوگ اتنا نہیں خیال کرتے کہ کسی کو تکلیف دینے کا تم کو حق کیا ہے تم بیمار ہے تو اچھا بات ہے اتنے روز منیرا کو کام کرنا چاہیئے۔ اگر اس سے پہلے ہم کو آدمی مل گیا تو ہم اس کو چھوڑ دے گا"۔

رحیما "بھلا بیوی ذرا انصاف سے بات کرو جوان بچی کیسے اپنے چھوڑ دوں خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی وہ ہے کہاں"؟

شاہدہ چلی گئی تو رحیما نے حسرت سے اس کی ماں کی طرف دیکھا جب وہ بھی خاموش رہی تو باہر آئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی کہ شاہدہ واپس آئی اور حکم دیا "اس بڑھیا کو ابھی نکال دو"۔

نکلی، چلی، گھر پہنچی بخار تیز تھا۔ جسم پُھنکا جا رہا تھا لیٹی مگر نہ لیٹا گیا۔ اُٹھی کھڑی ہوئی کلیجہ میں پھر ہوک اُٹھی اور اسی طرح تڑپتی تڑپاتی آئی۔ شاہدہ آرام کرسی پر بیٹھی تھی کہ رحیما نے گڑگڑا کر کہا:۔

"بیگم خدا کے واسطے غصہ کو تھوک دو اور مجھ پر رحم کرو میں نے اتنے دن آپکی خدمت کی ہے آخر کچھ تو میرا بھی حق ہے مجھ پر اگر کوئی مصیبت آتی تو آپ ہی کے

پاس پہنچتی۔ آپ خیال تو کیجیے کہ آخر جوان بیٹی کو کوئی بھی آنکھ سے اوجھل کرتا ہے بیگم کنواری لڑکیوں کی آبرو تو موتی کی سی آب ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ کیا وقت جا رہا ہے۔ دوپہر سے بچی مجھ سے چھوٹی ہوئی ہے۔ میں تو بیگم اپنا بخار بھی بھول گئی۔ للّٰلہ اپنے امّا باوا کا صدقہ، بہن بھائیوں کا صدقہ۔ مجھ پر رحم کیجیے اور بتا دیجیے کہ میری بچی کہاں ہے۔ اگر کہیں اور بھیجا ہے تو میں گرتی پڑتی وہیں پہنچوں گی اور اس کو لاؤں گی"۔

شاہدہ ۔"میں ماما کی طرح سیدھی اور زاہدہ کی طرح بیوقوف نہیں ہوں کہ اس لفاظی میں آجاؤں۔ میں نے جو بات تھی وہ کہہ دی"۔

رحیما ۔"بس تو بیوی میں تھانہ میں جاتی ہوں"۔

اتنا سننے ہی شاہدہ آپے سے باہر ہو گئی۔ بلّا اُٹھا تڑا تڑ ایسے مارے کہ بڑھیا بلک گئی۔ اور روتی ہوئی بھاگی۔

شاہدہ نے اتنی ہوشیاری اور کی تھی کہ چلتے وقت منیراؔ کے ہاتھ میں ایک سونے کا چھلّا ڈال دیا تھا۔ بچی تیرہ برس کی جان کبھی بھولے سے کبھی رات کو پھوپھی سے جُدا نہ ہوئی۔ ذرا چراغ جل جاتے تھے تو غریب کو ایک ایک لمحہ ایک سال ہو جاتا تھا۔ اب جو اس دھوکے میں پڑ حمیدہ کے ہاں پہنچی تو اس کا لڑکا شرابی کبابی، جواری ڈھنڈاری، نشہ میں دُھت، نالائقی میں مست، منیراؔ کو دیکھ لگا بہکی بہکی باتیں کرنے۔ بچاری کو سناٹا آگیا؟ کچھ دیر تو چُپکی بیٹھی رہی اور پھر سیدھی اُٹھ دروازہ کھول، گھر سے باہر آ جدھر مُنہ اُٹھا ہولی۔ رات کا وقت عورت ذات، بازار سے ناواقف، محلّہ سے بے خبر، چاروں طرف ڈھونڈھتی پھری۔ خاک پتہ نہ چلا۔ کہیں آدھی رات کے قریب پوچھتی پوچھتی گھر پہنچی تو پھوپھی بدنصیب دروازہ کھولے بیہوش پڑی تھی۔ آکر ہشیار کیا۔ بڑی مشکل سے آنکھ کھلی تو گھبرا کر

اُٹھی بھتیجی کو کلیجہ سے لگایا اور اتنا روئی کہ پھر غش آگیا۔ رحیمؔا کی حالت
لمحہ بلمحہ ردّی ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے کہیں ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوش آیا۔
تو پانی مانگا اور کہا:۔
"خدا کے واسطے منیراؔ میرے منہ اور ہاتھ میں لکڑیاں جل رہی ہیں
ان پر پانی ڈال دے۔ بلا سے ذرا تو ٹھنڈک پڑے"۔
منیراؔ نے پانی ڈالا تو ذرا جان میں جان آئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ دلہن ایک
دن اور ایک رات کا بھوکا اُدل جلول بک رہا تھا کہ دروازہ پر دو سپاہی
اور ایک دفعدار آموجود ہوئے اور دندناتے اندر گھسے چلے آئے۔
"منیراؔ تیرا نام ہے یہ چھلا تو خیر نکل آیا۔ بٹن کہاں ہیں"؟
منیرا۔ "چھلا کیسا"؟
دفعدار۔ "چوری اور سر زوری! مال موجود چور موجود اس کے باوجود
تو پوچھتی ہے بٹن کیسے؟ مس صاحب کے بٹن اور چھلا تم دونوں لیکر بھاگیں۔
بٹن سیدھے ہاتھ سے اِدھر دے"۔
منیراؔ۔ "اجی ہم تو چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھ میں مس صاحب نے
زبردستی پہنا دیا تھا"۔
دفعدار۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ چل ہمارے ساتھ آ۔ تو بھی کھڑی ہو
رہی۔ ادھر چل"۔
آگے آگے بیمار اور پیچھے پیچھے مردہ رحیمؔا۔ اس کے ساتھ معصوم اور
سیدھی سادھی منیراؔ ان کے پیچھے سپاہی اور دفعدار سب مل ملا کر تھانے پہونچے
تھوڑی سی کھا پڑھی ہوئی ہوا دونوں پھوپھی بھتیجیاں حوالات کر دی گئیں۔
اس واقعہ کی تیسری رات تھی۔ دو بج رہے تھے۔ احاطہ حوالات کے

ہر سمت خموشی چھائی ہوئی تھی۔ پیپل کے سبز پتے اور گلابی بانس کی کونپلیں ان دونوں بیگناہوں پر حسرت کے آنسو گرا رہی تھیں۔ دفعتاً رحیماً کی طبیعت زیادہ بگڑی اُس نے منیراً کو اپنے پاس بلا کر کلیجہ سے لگایا اور کہا:۔

"میرا اب آخر وقت ہے۔ زندگی کی اُمید نہیں میرے بعد خدا کے سوا تیرا کوئی وارث نہیں۔ مقدمہ کا نتیجہ جو کچھ ہو گا۔ تقدیر کا لکھا ہے مٹنے والا نہیں۔ خدا مس صاحب کا بھلا کرے۔ آہ میری محنت کا بدلہ، میری خدمت کا سلوک یہی تھا۔ خیر خدا اُن کو خوش رکھے۔ میں نے ان کا نمک کھایا ہے۔ بددعا نہ دوں گی۔ اب میری آواز نہیں نکلتی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں تھوڑا سا پانی اگر مل جائے تو ٹپکا دے"۔

پھوپھی کی گفتگو سنتے ہی منیراً بیتاب ہو گئی۔ اس کے قدموں میں گر پڑی اور کہنے لگی:۔

"اس حالت میں۔ میں بے گناہ گرفتار ہوں۔ پھوپھی جان خدا کا واسطہ یہاں میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ میں نہ معلوم کیسی تقدیر لے کر آئی تھی۔ کہ میری وجہ سے آپ پر بھی مصیبت آ گئی۔ پانی کہاں سے لاؤں؟ گھڑا خالی پڑا ہے"۔

رحیما "ہائے بچی بدن جھلسا جا رہا ہے خدا کا واسطہ پانی"۔

منیراً "اے بھائی پہرے والے تھوڑا سا پانی دیدو۔ میری پھوپھی کی حالت بہت خراب ہے"۔

پہرے والا "تجھ کو یہاں چھوڑ کر دو کوس پر پانی بھرنے جاؤں کہ تو بھاگ جائے"۔

رات مریض پر تڑپتے تڑپتے اور بلکتے بلکتے صبح ہوئی۔ آٹھ بجے کے قریب کوتوال صاحب آئے ملزموں کو دیکھا اور رحیماً سے پوچھا تو ۳ ۔ سلنے کرا۔

"ہم دونوں پھوپھی بھتیجیاں چور ہیں۔ یا نہیں خدا ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ ہاں تقدیر میں جو رسوائی ہونی تھی وہ ہو گئی۔ یہ میری جوان بچی گھر چھوڑ قید میں آ گئی۔ ہم اپنے گھر میں رہتے تھے جو روکھی سوکھی خدا دیتا تھا کھاتے تھے۔ یہ خبر نہ تھی کہ قسمت یہ دن بھی دکھائے گی۔ اپنی تکلیف کا خیال نہیں۔ ہاں یہ رنج ہے کہ ہماری آبرو برباد ہو گئی۔ ہم برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اب اس بچی کو کون قبول لے گا۔ جو ہم پر پڑی خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ یہ بچی نہ لینے میں نہ دینے میں۔ ناحق بیگناہ گرفتار ہوئی ہے۔ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم غریب ہیں مفلس ہیں میں بیمار ہوں مر رہی ہوں ہم پر رحم کیجئے۔ خدا آپ پر رحم کرے گا۔"

رحیماً کی گفتگو سچی تھی۔ کوتوال آدمی معقول تھا۔ بات سنتے ہی تہ کو پہنچ گیا اور اسی روز دونوں کو رہا کروا دیا۔

آٹھواں باب

زاہدہ۔ "ہاں آپا جان نانی صاحبہ کے کچھ اور حالات بیان کیجئے۔ مجھے تو ان کی باتوں میں بہت ہی لطف آتا ہے۔ ہم بد نصیب ہیں کہ ہم کو ان کی زیارت تک نصیب نہ ہوئی۔"

ماں۔ "ارے بیٹی کیا سناؤں وہ باتیں خواب خیال ہو گئیں۔ وہ صورتیں خاک میں چھپ گئیں۔ مرنے والیوں کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اب وہ صورتیں کہاں؟ اب تو نئے نئے لوگ نئی نئی باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ اگلی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں نہ سننے میں۔ جدھر دیکھو نئے دور اور جس طرف آنکھ اٹھاؤ انوکھے رنگ۔ وہ بیٹیاں ہیں نہ مائیں وہ گھر والیاں ہیں نہ بیویاں۔ میرے تو دیکھ دیکھ اوسان اڑے جاتے ہیں۔ دکھڑے کیوں جاؤں اور کس کو کیا کہوں۔ اپنا ہی گھر دیکھو اپنی ہی

پیٹ پر نظر ڈالوں۔ رحیمہ کے ساتھ جو ہوئی ہے۔ میرے تو بدن کے رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔ خبر نہیں بیچاری پر کیا گزری۔ میں تو اس کی صورت کو ترس گئی
بھلا وہ بچی معصوم آس نہ پاس غریب لپیٹ میں آ گئی"۔

زاہدہ۔" ہاں اماں۔ یہ تو سچ کہتی ہو۔ میں بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔
جیسا وہ روتی آئی ہے اور گھرکیاں پڑ رہی ہیں"۔

ماں۔" کوئی آج اسی گھر میں نئے نوکر اور مامائیں تو آئے ہی نہیں۔ اللہ
نے اپنی اپنی حیثیت کے موافق سب ہی کو دیئے ہیں۔ اماں جان کے ہاں بھی کہ
بیچارے غریب آدمی ہیں ایک لڑکی چھوٹی اٹنگ پڑی ہوئی ہے۔ مگر بڑی پھوپھی
کے ہاں نقش بی ایسی آئی کہ مر کر ہی نکلی۔ جوانی اور بڑھاپا سب کا سامنے اسی دہلیز پر
کاٹ دیا۔ ڈیڑھ برس کی رانڈ ہوئی مگر اس آن کی عورت تھی کہ اس کا پلنگ تک کسی کو
دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نانی جان کے ہاں کا حال تو کیا سناؤں اللہ کا شکر ہے ان کے
ہاں ایک چھوڑ تین تین مامائیں گھر میں اور دو نوکر اور ایک باورچی باہر تھے مگر وہ تو نوکروں
اور ماماؤں پر کیا موقوف ہی تھے اور پڑوس تک کو عزیزوں سے زیادہ سمجھتی تھیں آج
کے زمانہ میں اگر وہ ہوتیں تو یا تو یہ دنیا ان کو بیوقوف سمجھتی یا وہ اس دنیا کو دیوانہ۔ تم کو بھی
شاید تعجب ہوگا بھنگن سے لیا اور بہشتی سے بھائی کر کے بات کرتی تھیں۔ ماما نے کسی
رشتہ کی عورت کا بچہ لے کر پال لیا۔ اور وہ مر گیا۔ بچہ برس دو برس کا نہیں پانچ چار
مہینہ کا نہیں فقط چھ دن کی جان۔ گرمی کا یہ حال کہ چیل انڈا چھوڑے دو دن ماما
نہیں آئی۔ تیسرے دن آئی تو اس سے یہ تک نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کے دانت۔
اس پر غضب یہ کہ آپ چولہے کے آگے بیٹھی روٹی ڈال رہی ہیں اور دم نکل رہا ہے
اس نے آ کر رونا شروع کیا تو آپ بھی روٹی چھوڑ چھاڑ اس کے ساتھ رونے بیٹھ گئیں۔
رشتہ کی ایک خالہ وحیدہ کی وحیدہ کی تھیں یہ تو خبر نہیں کہ کیا رشتہ تھا۔

اور کس کی بیٹی بیوی تھیں۔ مگر اتنا سنا تھا کہ ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہیں۔ ہم سیٹھے کنوئیں ہیں۔ وہ چھوٹی بارہ دری، چار آنہ ڈولی کا فاصلہ، کبھی جانا بھی ہوتا تھا تو چلتے چلتے آندھ آجاتی تھی۔ مگر ان خالہ وحیدی کی وضعداری یہ تھی کہ آندھی جائے مینہ جائے مگر ان کا جمعہ کا پھیرا ناغہ نہ ہو۔ ساٹھ برس سے اوپر عمر تھی۔ مگر حال یہ تھا کہ جب تک رہیں بارہ مہینے لکڑی ہاتھ میں، برقع سر پر، چلی آرہی ہیں۔ نانی جان ہزاروں روپے کی آدمی تھیں۔ مٹکے کے مٹکے اشرفیوں کے بھرے پڑے تھے مگر جمعہ والے دن دوپہر ہی سے ان کی راہ دیکھنے بیٹھ جاتی تھیں۔ خالہ وحیدی کی آن یہ کہ ایک آنہ کا پانوں کا مٹھا ہمیشہ ہاتھ میں لیکر گئیں اور نانی جان کا شوق یہ کہ صورت دیکھتے ہی لپکیں۔ اور دروازہ میں جاکر پان لئے پھر کیسی گھل گھل کر اور مل مل کر گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں کہ دیکھ کر بھی تعجب ہوتا تھا۔ مزا یہ تھا کہ جب تک وہ بیٹھی رہتی تھیں ممکن نہیں کہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجائیں۔ ہمارا بچپن تھا ہم کو ان کی صورت دیکھ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ ماموں جان نے ایک دفعہ اتنا کہہ دیا تھا کہ خالہ سے پیچھے باتیں کرلینا پہلے میرے کپڑے نکلوا دو۔ اس پر اتنی بگڑیں کہ تین دن تک وہی کپڑے پہنے اور چہ ہا سے پھرے۔ مگر انہوں نے کپڑے نہ دئے۔ جب چوتھے دن قصور معاف کروایا اور عہد کیا کہ آئندہ نہ کہوں گا تو راضی ہوئیں۔ رشتہ نہیں، ناتا نہیں، کنبہ نہیں، برادری نہیں۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک سب کا منہ خالہ خالہ کہتے خشک ہوتا تھا۔ ایک ان کے ساتھ کیا۔ ہم نے سب کے ساتھ ان کو اسی طرح ملتے دیکھا اور بات کرتے سنا۔

سمیعاً گھر کی لونڈی تھی۔ اس کی لڑکی پانچ برس کی مری۔ رات بھر مردے کو کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہی۔ اس کا میاں اتنا نالائق تھا کہ شادی ہوتے ہی طوطے کی طرح دیدے بدل گیا۔ کبھی برسویں چھٹے چھ مہینے ایک آدھ دن کو بھیج دیتا، مگر جب وہ بیمار

بچہ کو لئے ڈولی سے روتی اُتریں اور اُس کے میاں نے آکر کہا "بیگم صاحب دیکھئے تو سہی یہ نٹھیوا کو کیا ہو گیا" ۔ تو اپنے ہاتھ سے چھوٹا بچہ لڑکی کو لٹا دیا ۔ خود دوا پیس کر دونوں وقت پلاتی تھیں"۔

میری آنکھیں جو سماں دیکھ چکی ہیں وہ اب نظر نہیں آسکتا ۔ دل ان صورتوں کو نگاہیں ان چہروں کو اور کان ان باتوں کو تڑپ رہے ہیں ، ترس رہے ہیں اور پھڑک رہے ہیں ۔ میرے ماموں جان کی شادی ہے ۔ دیگیں آنگنائی میں رکھی ہیں اور آپ مونڈھے پر بیٹھی کھانا تقسیم کر رہی ہیں ۔

مجھ جیسا ایک بن ماں باپ کا بچہ نو دس برس کا ہوگا ۔ پچاس روپے کی لیمپ کی جوڑی ہاتھ میں لئے آیا اس کی بھی خطا تھی اور نانا جان کو بھی معلوم نہ تھا ۔ "انہوں نے اصل میں جوڑی بھیجی نوکر کے ہاتھ ۔ اس بیوقوف نے پہلے تو دو چار آوازیں ماماؤں کو دیں ۔ مگر شادی کا گھر ۔ کچوریاں پک رہی تھیں ۔ سنتا کون تھا ۔ لڑکا اتفاق سے پہنچ گیا ۔ اس کے ہاتھ میں دیدی ۔ بچہ نام کا تو لڑکا تھا ۔ مگر کچھ بچہ ہی تھا ۔ خوشی خوشی لے آیا ۔ چبوترے پر چڑھ رہا تھا کہ پاؤں رپٹا اور دونوں چمن سے گر پڑیں ٹکڑے ہو گئے ۔ نانی جان دنگ تھیں ۔ مگر نانا جان کا غصہ بہت تیز تھا ۔ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور لڑکے کو پکڑ مردانہ میں لے گئے ۔ خدا جانے ادھر مار کُٹی یا کھال اُدھیڑتے ۔ اللہ نانی جان کو بخشے ۔ مہمانوں کو چھوڑ پردہ کرا مردانہ میں پہنچیں اور کہنے لگیں ۔

"صوبیدار صاحب اس بدنصیب بچہ نے اپنی بیوقوفی سے دونوں لیمپ جنہیں تیل پڑنا تک نصیب نہ ہوا ضرور توڑے مگر جس وقت تم اس کا ہاتھ پکڑ کر چلے ہو اس وقت اس کی نظریں جن میں بیگناہی کا عذر تھا تمہارے چہرے پر تھیں ۔ میں اس وقت اس کے دل کی کیفیت دیکھ رہی تھی ۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا ۔ اس کی زبان خاموش تھی اس کی آواز نکلتی نہ تھی اور اس کی حالت اس وقت گائے کی سی تھی جو قصائی کے قبضہ میں تیز چھری کے

دیکھ کر سہم رہی ہو۔ میں جانتی ہوں یہ معصوم ہمارے پیٹ کی اولاد نہیں۔ مگر اس کی یتیم صورت، اس کی خاموش آنکھیں، چُپ بٹھیں اور اب بھی ہمارے رحم کی خواستگار رہیں۔ یہ ایک مظلوم انسان اور ایک بیگناہ ہستی ہے جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہمارے بس بیں ہے۔ ہم کو اختیار ہے کہ ہم ماریں پیٹیں۔ سزا دیں۔ چھوڑیں۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ ہے نہ ماں کی شفقت، اس کی تکلیف سے، اس کی مصیبت سے باپ کا دل، ماں کی مامتا متاثر ہونے والی موجود نہیں۔ مگر آج وہ دن ہے جو ہزاروں ارمانوں۔ سینکڑوں منتوں سے ہم کو میسّر آیا۔ اس خدائے برحق نے ہم کو یہ خوشی عطا فرمائی جس کی مخلوق اسوقت ہمارے رحم کی منتظر ہے اور جو خود ہماری حالت کا مطالعہ کر رہا ہے۔ صوبہ دار صاحب اس کے قبضہ میں کچھ نہیں یہ رو کر چُپ، سہلا کر خاموش اور پٹ کر ساکت ہو جائے گا۔ مگر اس کی آنکھ کا ہر آنسو، اس کی آہ کا ہر حصّہ بہت وزنی ہوگا۔ یہ بے بس کی فریاد اور بیکس کی شکایت ہوگی۔ اس سرکار میں اور اس دربار میں جو ازلی ابدی ہے۔

صوبہ دار صاحب بہت نازک وقت ہے للّٰہ اس بچّے کو کلیجے سے لگا لیجئے اور اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھئے وہ آسمانی بادشاہت کا راج کرنیوالا تختِ حکومت پر نظر آتے گا۔ اس سے التجا کیجئے اور ہم سے آمین کہلوائیے کہ اپنے حبیبؐ کے طفیل اپنے رسولؐ کا تصدق اس طرح ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور ہم پر رحم کرے"۔

ہم سب کوٹھے پر کھڑے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ نانا جان ہنسنے لگے تو اس کو خود نانی جان نے گلے سے لگا لیا اور ساتھ لے کر آئیں۔ پاس بٹھا لیا اور کھانا نکالنے لگیں بچے رات زیادہ آگئی تھی وہیں پڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ رات کا ایک بجا ہوگا کہ کھانا نکال کر خود کھانے بیٹھیں، بچہ کو جگایا پہلے اس کو کھانا کھلایا۔

کیا وقت تھا۔ بچہ کھانا کھا رہا تھا اور وہ اپنے ہاتھ سے اس کو پانی

دے رہی تھیں۔

کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھیں کبھی اس کو چمکارتی تھیں۔

جب بچہ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد انگنائی میں آئیں۔ یہ خبر نہیں کیا۔ مگر گڑگڑا کر دعا مانگی اور پھر آ کر خود کھانا کھانے بیٹھیں۔

نواں باب

جس طرح زاھدہ کی شادی کا اختیار از ابتدا تا انتہا ساجدہ کو تھا۔ اسی طرح شاھدہ کی شادی کے متعلق اس کی مجال نہ تھی کہ وہ دم مار سکے۔ رقعہ آیا۔ دیکھ بھال بات چیت کچھ نہ ہوئی۔ صرف ایک شام کو اتنا معلوم ہوا کہ کل شاھدہ کا نکاح ہے۔ ماں نے اتنا تو کہا "کیا کہہ رہے ہو۔ مائیوں بھی نہ بٹھاؤ گے"۔ مگر جب یہ سنا کہ "تم ان باتوں میں دخل نہ دو اور ایسی لغو رسم کا ذکر اب میرے سامنے نہ کرنا"۔ تو خاموش ہو گئی۔

دوسرے دن سہ پہر کو مہمان آنے شروع ہوئے مگر کون؟ ماں کا ملنے والا ایک نہیں۔ باہر باپ کے ملنے والے اور اندر لڑکی کے!

ایسی حالت میں غریب دخل ہی کیا دے سکتی تھی اور اس کی رائے کو پوچھتا کون تھا اور اگر ہماری رائے غلط نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس کا بڑا حصہ خود دلہن کے مشورے اور سہیلیوں کی صلاح ہے۔

المختصر شاھدہ مسز حسن بن اور میکے سے وداع ہو سسرال جا پہنچیں۔

ایم ڈبلیو حسن ڈاکٹر تو نہ تھے۔ مگر ڈاکٹری کی تعلیم کے واسطے دو دفعہ ولایت گئے اور دونوں دفعہ جیسے گئے ویسے آ گئے خوشحال باپ کا بیٹا تھا۔ روپیہ کی کمی نہ تھی۔ مگر سوا اس کے کہ نام مسلمانوں تھا شروع سے آخر تک اور گھر سے باہر تک کوئی

چیز اسلام کی نہ تھی۔ لباس۔ خوراک رہنا سہنا۔ کھانا پینا۔ ملنا جلنا۔ بولنا چالنا غرض ہر فعل اور ہر قول مسلمانوں سے سینکڑوں کوس دور تھا۔ اور اسی پر بس نہ تھی غضب یہ تھا کہ روزہ دار جاہل اور نمازی بیوقوف سمجھے جاتے تھے۔ قیاس یہیں تک ختم ہوجاتا تو خیر، اگلے زمانہ کے سیدھے سادے مسلمانوں کا تو وہ مضحکہ اڑتا تھا کہ خدا کی پناہ۔ برائیاں ان میں ہوتی تھیں۔ بیوقوف وہ بنتے تھے، بربادی قوم کا سبب وہ، جہالت کا باعث وہ، افلاس کی وجہ وہ، غرض کوئی عیب کوئی خرابی کوئی نقص اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ ہو۔ یہ رنگ بیس پچیس برس سے مسٹر حسن کے خاندان پر چھایا ہوا تھا اَلْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ خدائی فیصلہ ہے۔ گاڑھے میں گاڑھے اور زربفت میں زربفت کا پیوند ٹھیک ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے خیالات کی وہ میزان بیٹھی کہ سبحان اللہ۔ آٹھ نو سو روپے ماہوار کا کرایہ جائداد کا تھا۔ دو سالم گاؤں علیحدہ تھے۔ روپیہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ بچے صرف دو حسن اور حسینہ اور دو میاں بیوی، چار دم جن میں اب ایک اور بڑھ گیا پانچ آدمیوں میں ڈیڑھ ہزار کے قریب آمدنی نہایت بے فکری اور اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔ چار مائیں دو چھوکریاں۔ اندر خانساماں۔ باہر سائیس اردلی۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ماماؤں کا یہ حال تھا کہ چھوکری بھی دروازہ پر آتی تو کہتی کہ "سائیس سے بولو گاڑی کھینچے"۔ اب شاہدہ کی روزانہ زندگی یہ تھی:۔

آٹھ بجے کے قریب سوکر اٹھتی۔ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چائے کی پیالی اور دو انڈے کچھ توس کھاتی۔ اس کے بعد غسل خانہ جاتی۔ نہا دھو کر باہر آتی۔ بال بنواتی کپڑے پہنتی اور ڈاک دیکھتی۔ کھانا کھاتی۔ اخبار پڑھتی۔ سو جاتی۔ اٹھ بیٹھتی۔ منہ ہاتھ دھوتی کنگھی کرتی۔ کلب جاتی آتی۔ اخبار پڑھتی۔ کتاب دیکھتی۔ باتیں کرتی سو جاتی۔ دو ڈھائی سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ماں کے نام سے تو اس کو ہمیشہ

نفرت رہی اور ماں کے ساتھ ہی زاھدہ دشمن تو نہیں۔ مگر کچھ ایسی دوست بھی نہ تھی۔ ہاں سو عقلمندوں کا عقلمند اور داناؤں کا دانا وہ باپ تھا جس نے بیٹی کو اپنا دیوانہ بنا دیا۔ ہفتہ میں ایک دو مرتبہ اس سے ملنے کو البتہ آجاتی اور دنیا دکھاوے کی شرم یا پیٹ میں رکھنے کا لحاظ جو کچھ بھی تھا۔ کھڑے کھڑے ماں کو بھی صورت دکھا جاتی ورنہ وہ میکے کے نام سے متنفر اور صورت سے بیزار تھی۔ حد یہ ہے کہ دو برس شادی کو ہو گئے۔ دکھ سکھ بھلی بری صحت علالت سب ہی طرح سے گذری مگر اس نے ایک دن کیا ایک لمحہ کیواسطے ماں یا بہن کا آنا اپنے گھر پر گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک چھوڑ دو دو زچہ خانے ہو گئے۔ پہلا بچہ خاصا آٹھ روز زندہ رہا۔ پیدا بھی ہوا مرا بھی۔ مگر جینے میں یا مرنے میں ماں نہ آسکی۔ گھر بیٹھے بیٹھے مامتا کی ماری ہر چند جلی اور تڑپڑائی۔ مگر وہاں جانے کی اجازت نہ ملی۔ اس لئے کہ معقول پڑھے لکھے شریف ہشیار سمجھدار آدمیوں میں جاہل پھوہڑ وحشی نالائق آدمی کے جانے سے سوائے بدنامی کے کیا حاصل۔ دوسرا بچہ نرس کے طفیل نانی کے ہاں آجاتا اور دونوں دیکھ لیتیں مگر دور سے کیونکہ ایسا نہ ہو کسی کی بری عادت بچہ پر اثر ڈال دے یہ بچہ جس روز سے پیدا ہوا اس روز سے ایک نرس کے سپرد کر دیا گیا تھا تعلیم جدید نے جہاں دنیا کے انسانوں سے بہت سے نقائص دور کئے ہیں وہاں دودھ بھی ماؤں کے سینہ سے خشک کر دیا ہے کہ بھیڑ بکری کا شیوہ ہے۔ پھر بھلا شاہدہ کے واسطے اس سے زیادہ کسر شان کیا ہوتی کہ وہ کلب میں بیویوں کے سامنے بچہ کو گود میں لئے چھاتی سے لگائے بیٹھی ہیں اور بچہ چسر چسر کر رہا ہے۔ بچہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ انا مقرر ہو گئی۔ گو وہ قوم کی دھیمی ہی کولن چماری تھی۔ مگر گھر والوں کے بہ خنتے دیکھ سمجھ گئی کہ نبھا مشکل ہے۔ اس سے پہلے کلکٹر صاحب کے بچے کو دودھ پلا چکی تھی۔

ایک ہفتہ کا نوٹس دے ٹھیک ساتویں دن سب کے سامنے بچہ کو چھوڑ سیدھی

ہو لی بہتیرا حسن اور شاہدہ منت خوشامد کرتے رہے۔ مگر اس نے خاک نہ سُنی آخر شاہدہ اپنی اگلی طبیعت پر آئی اور کہنے لگی:۔

"ہم تم کو پولس میں بھجید ے گا۔ ہمارا بچہ بھوکا مرے گا"

انّا: "ایسی ایسی پولس میں بھیجنے والیاں ہیسیوں دیکھی ہیں ہم نے اسی واسطے نوٹس دیا تھا اور تم سے پہلے پولس میں رپورٹ اور میم صاحب سے ذکر کر دیا ہے"

اب آگے نقلی میم صاحب کیا بول سکتی تھیں دہم ہی تو ہو گئیں اور انّا اپنا بستر سنبھال سیدھی ہو لی۔

انّا کے جاتے ہی میاں بیوی، ساس نند، سب ہی کے چھکّے چھوٹ گئے سوال یہ تھا کہ جا کہاں سکتی ہے بجتی ہے بکنے دو۔ یہ خبر نہ تھی کہ انّا سچ مچ کی میم صاحب نے چاروں طرف تلا توپ ڈالی، نوکر چھوڑے۔ مامائیں گئیں۔ ہر سمت تلاش کیا۔ ایک ایک سے کہا۔ لیکن انّا بازار کی مٹھائی تو تھی نہیں کہ مول آجاتی۔ بارہ گھنٹہ کا دن صاف آنکھوں میں کٹ گیا اور چھ مہینہ کا بچہ بھوکا پیاسا دودھ کو بلکتا اور انّا کو ترستا رہا تعلیم یافتہ گروہ میں سے تو کوئی کام نہ آیا۔ ان کو ضرورت نہیں کہ مدد کریں نہ کسی کو حق کہ تکلیف دے۔ ہاں ماں نے جب یہ خبر سُنی مچھلی کی طرح تڑپ گئی۔ جب شام تک کچھ انتظام نہ ہوا تو زاہدہ سے کہنے لگی "بیٹی لا میں اماں کے ہاں ہو آؤں۔ وہاں شاید کوئی انّا مل جائے"۔ زاہدہ نے اس رائے سے اتفاق کیا تو ماں کو کیفیت جا کر سُنائی۔ اُنھوں نے کہا "بیٹی انّا کا ملنا تو ایسی بڑی بات نہیں بستی ہی موجود ہے ڈیڑھ برس کا بچہ گود میں دودھ پی رہا ہے۔ غیر بھی نہیں دُور پرے کی رشتہ دار ہے مگر شاہدہ کا نام ایسا نکل گیا ہے کہ سب کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ بستی ہے تو غریب اور مصیبت ماری نگوڑی ایسی رانڈ ہوئی ہو کہ صورت دیکھ کر جی کڑھتا ہے۔ خاصی کھاتی پیتی ایک میاں کے مرنے سے دو دو دانوں کو محتاج ہو گئی۔ نوکری تو وہ کیا کرے گی کمبخت کبھی گھر

سے نکلی نہیں ہاں میرے کہنے سے دو چار دن کے لئے چلی جائے گی۔ جب تک انّا کا
انتظام ہو۔ مگر ایسا غضب نہ ہو کہ بی شاہدہ اپنے میم پنے میں کوئی ایسی ویسی بات
کہہ بیٹھیں۔ جا بیٹی ذرا بسنتی کو تو بلا لا"۔

دونوں ماں بیٹیوں نے بسنتی کو بلا کر رضامند کیا۔ پہلے تو بسنتی انکار کرتی رہی
جب اصرار حد سے بڑھ گیا تو کہنے لگی "خالہ جان اچھی بات ہے مگر میں نوکری تو
کرتی نہیں اپنا بچہ سمجھ کر دو چار دن کو مہمان کے طور پر چلی جاتی ہوں"۔

بسنتی کو رضامند کر اسی وقت ڈولی منگوا پرچہ لکھ ماں نے شاہدہ کے
پاس بھیج دیا۔ اور مسٹر شاہدہ حسن کے صاحبزادے ماسٹر محسن بسنتی کا دودھ پینے لگے۔

اپنے مطلب کے دیوانے بھی سیانے ہوتے ہیں پھر شاہدہ تو ماشاء اللہ
سو سُرتوں کی سُرتی تھیں۔ اپنی غرض باولی، اپنا مطلب اندھا، جی کھول کر خاطر
کی۔ زبان بھی میٹھی۔ باتیں بھی اچھی۔ دوسرا انتظام چار دن کیا پندرہ دن بھی نہ
ہوا تو بسنتی کو کہنا پڑا۔

"بیوی اب مجھے رخصت کیجئے۔ میں تو صرف چار دن کو کہہ کے آئی تھی"۔

یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ رخصت اور فرصت اگر طبیعت ہے تو ہر وقت ہو۔
یہ کیا اپنے وقت پر تو منہ بولائی بن گئے۔ اور جب اپنی غرض نکل گئی تو ماش کے
آٹے کی طرح اکڑ رہے ہیں بسنتی بیچاری سیدھی سادی مصیبت زدہ سات پانچ
اور دھوکا فریب جانے کیا اور سمجھے کیا۔ شاہدہ نے اس کی سادگی سے فائدہ
اُٹھایا اور ایسا شیشے میں اُتارا اور وہ راگ دیا کہ ہاں کرنی پڑی اور کہہ دیا کہ:۔

"اچھی بات ہے آپ انّا کا انتظام کیجئے میں دودھ پلا دوں گی"۔

باتوں میں تغیر اور خوشامدوں میں کمی تو دوسرے ہی روز سے شروع ہو گئی تھی
مہینہ بیس روز تو رنگ ہی اور تھا بسنتی دیکھ دیکھ کر متعجب اور حیران ہوتی جاتی تھی کیا تو

جناب جناب کہہ کر مُنہ خشک ہوتا تھا یا جناب سے تم، تم سے بیتی اور بیتی سے انّا بن گئی۔ مگر زبان دُسے بکی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ یہ زبان وہ چیز ہے جس سے بیٹا بیٹی پرائے ہو جاتے ہیں۔

اوّل اوّل تو آٹھویں دسویں جب جی گھبرایا اور جی چاہا گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھر آئی۔ مگر پھر تو شاھدہ نے وہ رعب بٹھایا کہ ضرورت بھی ہوتی تھی تو اجازت لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

وقت کی بات ہے کہ جاڑے ختم ہوئے اور گرمی شروع۔ ابھی رات کی سردی خاصی باقی تھی کہ بخار چلے اور بخار کے ساتھ کھسرا اس غضب کی کہ خاصے اچھے کھیلتے ہنستے بچے تین تین چار چار دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ غضب یہ تھا کہ بچے ہی پر بس نہیں ساٹھ ساٹھ پینسٹھ پینسٹھ برس کے بڈھے بڑھیاں اس پر چل بسے۔ بیتی کا لڑکا شریف دو برس کا تھا اور طرّہ یہ چھوٹی آنکھ کا دیدہ سر چلے کا سر۔ بیتی کی زندگی کا سہارا اور دنیا کی تمام اُمیدیں جو کچھ تھیں وہ یہ بچہ۔ اسی اُوپر رنڈاپا کاٹ رہی تھی اور اسی اُمید پر جیتی تھی کہ بڑا ہو کر سب مصیبتوں کی تلافی اور رنجوں کا مداوا کر دے گا۔ بچہ کِھکِھیاتا آکر ماں کی گود میں پڑ گیا۔ ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا مگر ایک آدھ گھنٹہ بعد تو جسم کی یہ حالت کہ جیسے بھوبل۔ گھبراہٹ اور پریشانی کیسی۔ ماشا کی ماری کی جان نکل گئی۔ چاروں طرف بچے کو گود میں لئے سٹ پٹائی پھری۔ کبھی اِس سے کبھی اُس سے دیوانوں کی طرح ایک ایک سے پوچھتی، ایک ایک کو دکھاتی، ایک ایک سے صلاح لیتی۔ اس کے دل کی تو یہ حالت تھی۔ شاھدہ کو اپنی بڑی بیتی کے پاس آئی اور کہا:-

"انّا اس کو کھسرا نکلے گا اور یہ سب گھر بھر میں پھیلے گا تم اس کو فوراً علیحدہ کر دو اور اپنی ماما کے پاس بھیج دو۔"

بسنتی ۔" واہ بیوی واہ کیا کہہ رہی ہو! کس دل سے بھیجدوں اس کو تو وہاں بھیجدوں اور میں یہاں پڑی رہوں ایسا مجھے کیا لالچ واہ"!

شاہدہ ۔" ایسا ہونا چاہیئے ۔ اور ہوگا ۔ تمہارے بچہ کی وجہ سے ہم اپنا گھر بیمار نہیں کر سکتے"۔

بسنتی ۔" بیوی میں کب کہتی ہوں کہ تم اپنا گھر بیمار کرو۔ تمہارا گھر تم کو مبارک ہو میں اپنے بچہ کو لیکر چلی جاتی ہوں۔ ذرا ڈولی منگوا دوں"۔

شاہدہ ۔" تمہارا بچہ کا جینا نہایت ضروری جس کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ باپ اس کا نہیں۔ تم خود مفلس فقیر اور ہمارا بچہ بھوکا رہے تو تمہاری بلا سے"۔

بسنتی ۔" تو پھر جو آپ کہتے وہ کروں"۔

شاہدہ ۔" تم یہاں سے ہرگز نہیں جا سکتیں"۔

بسنتی ۔" اور میرا بچہ ؟"

شاہدہ ۔" اس کو جانا پڑے گا"۔

بسنتی ۔" واہ بیوی واہ کیا بات کہہ رہی ہو!"

شاہدہ ۔" سچ کہہ رہی ہوں"۔

ابھی یہ فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر حسن اندر آئے اور بیوی نے کہا:۔

" ڈیر حسن اتا کے بچہ کو بخار ہے اور چیچک معلوم ہوتی ہے اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ اس کو فوراً نانی اماں کے ہاں بھیجدیجئے کہ وہ اس کی نانی کو دیدیں"۔

بسنتی ۔" واہ بی واہ میں خود لے کر جاؤں گی"۔

شاہدہ ۔" تو ہرگز نہیں جا سکتی ۔ ہمارا بچہ بھوکا روئے گا"۔

بسنتی ۔" روئے گا تو میں کیا کروں"۔

شاہدہ ۔" گستاخی مت کر"۔

اب شاہدہ آگے بڑھی۔ بچہ کو زبردستی گود سے چھین آدمی کو دیا کہ فوراً لے جائے۔ بستی بچہ کے ساتھ جانے کے واسطے چلی۔ مگر آدمی نے اس کو اندر کر دیا اور شاہدہ نے کہا "تو اگر گئی تو عمر بھر جیلخانہ میں سڑے گی ہمارا بچہ کوئی وجہ نہیں کہ بھوکا رہے"۔ چونکہ ایسے بیمار بچہ کو شاہدہ نے ہاتھ لگایا تھا۔ جس کو چیچک کا اندیشہ تھا پورا غسل کیا اور باہر آکر جب دیکھا کہ ممتا کی ماری چاروں طرف ٹکراتی پھرتی ہے تو نہایت غصہ سے کہا "اس فضول جھگڑے سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں دوسروں کو پریشان کیا۔ لے پہلے نہا اور پھر بچے کو دودھ پلا"۔

اپنے سامنے نہلا دودھ پلوا بچہ نرس کو دیا اور خاص طور پر باہر کے آدمیوں کو تاکید کر دی کہ انّا نہ نکلنے پائے۔ دو یا تین مرتبہ غریب نے جانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ مجبوراً سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

بستی کا بچہ شریف جب نانی کے پاس پہنچا تو شاہدہ اور شریف کی دونوں نانیاں ششدر رہ گئیں۔ سبب پوچھا تو نوکر کچھ بتا نہ سکا۔ حیران تھیں کہ بیمار بچہ کو نوکر کا دے جانا اور بستی کا نہ آنا آخر معنی کیا رکھتا ہے۔ بچہ کا یہ حال تھا کہ بخار خوب تیز کا تھا مگر دو برس کے بچے کی بساط ہی کیا۔ آنکھ کھلتی تھی تو اماں اماں کہہ کر پکارتا تھا۔ معصوم کی اس حالت پر شاہدہ کی نانی کا دل بگڑ گیا۔ ڈولی منگوا سیدھی نواسی کے ہاں پہونچیں۔

پہلا روز پہلا اتفاق بلکہ شادی کے بعد نانی نواسیوں کا پہلا آمنا سامنا تھا۔ بستی نوان کی صورت دیکھتے ہی دوڑ کر روتی ہوئی لپٹ گئی اور پوچھا:۔

"خالہ جان میرا بچہ کیسا ہے؟"

"دیکھئے تو یہی میرے شریف کو نکال دیا کہ وہ بیمار ہے اور مجھے تڑپا جانے دیتیں باہر پہرے بٹھا دئے کہیں نہ نکلوں"۔

نانی: "بیٹی چل تو میرے ساتھ چل بیمار بچہ تڑپ رہا ہے۔ نوکر نہیں جا کر نہیں۔ اس ظلم پر کمر باندھی"۔

شاہدہ: "تو کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ میرا بچہ بھوکا مر جائے"۔

نانی: "مرضی اللہ کی اگر مر جائے تو مگر اپنا بچہ کیوں چھوڑے۔ تم کو دس ہزار دفعہ غرض تھی اس کو رکھا ہوتا۔ اب یہ اکیلی کیوں رہے چل بسنتی کھڑی ہو"۔

غریب کے اوپر سب شیر ہوتے ہیں۔ نانی کے سامنے اس لئے نہیں کہ وہ نانی تھیں بلکہ اس لئے کہ بگڑا ہوا انسان بھرا ہوا شیر ہو جاتا ہے۔ شاہدہ اور احسن دونوں چپکے کھڑے دیکھتے رہے اور وہ بسنتی کو ساتھ لے ڈولی میں بٹھا سیدھی ہو لیں۔

قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ بسنتی جس وقت چلی ہے تو اس کی آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ رستے بھر دعائیں مانگ رہی تھی اور کہتی تھی۔

"الٰہی اپنے حبیبؐ کا طفیل میرا بچہ تندرست ہو جائے"

بلبلاتی ہوئی اتری بچہ کو گود میں لیا۔ کلیجہ سے چمٹایا تو بخار ہلکا تھا۔ صبح تک بخار کا پتہ بھی رہا۔ اور بچہ خاصی اچھی طرح ٹہلنے لگا۔

اِدھر یہ گذری، اُدھر جو بندہ یا بندہ، انا کا انتظام ہو گیا اس کے دودھ کی آزمائش ڈاکٹرنی کی۔ چیچک کا دور تھا احتیاطاً انا کو نہلایا دھلایا نئے کپڑے پہنائے۔ بچہ کو دودھ دیا مگر نہ معلوم دودھ میں کیا زہر تھا کہ حلق سے اترتے ہی بچہ بخار میں لوٹا۔ ڈاکٹر آئے، لیڈی ڈاکٹر آئی۔ الغرض دو دن اور دو رات یہ تانتا بندھا رہا تیسرے دن دیکھا تو بچہ پر چیچک کا جال ہوا ہے۔ اب البتہ دیکھنا تھا کہ کون کون احتیاط کرتا ہے اور بات کے سامنے کبھی بات قائم رہتی ہے یا نہیں، لیکن افسوس وہ شوں شاں دوسرے ہی تک تھی اپنا بچہ پڑا تو حسن اور شاہدہ دونوں احتیاط وغیرہ سب بھول گئے چیچک والے بچے کو دونوں کے دونوں لپٹ لپٹ کر روتے اور چمٹ چمٹ کر پیار کرتے گرمی کا موسم بخار اس

غضب کا کہ ہاتھ نہ دھرا جائے۔ ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں نے ہر چند نسخے بدلے اور دوائیاں تبدیل کیں۔ مگر بخار نے جنبش نہ کی۔ شاھدہ اب بچہ کو خود اپنے ساتھ لیکر سوتی تھی اور سوتی کیا خاک تھی رات بھر روتی تھی سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ اس نو خیز پر ہاتھ پھیرتی تھی کہ پسینہ آرہا ہوگا۔ مگر بدن تو تا تیا تھا کہ دہکنے کے سوا کچھ تھا ہی نہیں موسم کی گرمی۔ بخار کی حرارت چیچک کا اثر آخر معصوم دماغ کہاں تک صحیح رہتا۔ سرسام ہو گیا۔ یہ بھی عجیب وقت تھا۔ بچہ گردن دے دے پٹکتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور آواز بمشکل تمام نکل سکتی تھی۔ اس وقت ماں کا یہ فعل بھی کچھ کم قابل بیان نہ تھا کہ بچے کی یہ کیفیت دیکھ کر اس نے نرس سے کہدیا کہ "تم اپنے پاس رکھو مجھے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے"۔ نرس کی ماں نہیں رشتہ نہیں نانا نہیں۔ سرسام میں گرفتار، معصوم اکیلا پڑا، سر دھنتا اور کوئی آکر جھانکتا تک نہیں۔ نرس اکثر بیٹھی رہتی مگر بعض دفعہ ضرورتاً اور کبھی کبھی خواہ مخواہ اکیلا پڑا چھوڑ کر چلی جاتی۔ یہ حالت چار روز اور چار رات رہی مگر گھر کے کسی آدمی کو آکر جھانکنا تک قسم تھا۔ نرس تھی۔ یا بچہ۔ چوتھی رات بچہ کی حالت اوّل شام سے ہی خراب ہو گئی تھی۔ آج آدھی رات کے وقت بچہ نے آنکھ کھولی مگر افسوس وہ آخری موقعہ تھا ان ہی آنکھوں سے جو بیٹھ چکی تھیں چاروں طرف دیکھا اور ایک ننھی سی سسکی کے ساتھ ہمیشہ کو بند ہو گئیں۔

بچہ کے مرتے ہی شاھدہ وحسن کا پہلا کام یہ تھا کہ مردے سے دور بھاگ گئے غسل دفن نوکروں نے کیا۔ مگر ہاں شاھدہ اس صدمہ سے جو فطرتی تھا محفوظ نہ رہ سکی۔ اس نے کوشش میں کمی نہ کی۔ لیکن جس قدر بھلاتی تھی اُسی قدر بچہ کی صورت زیادہ یاد آتی تھی۔

ماں شاھدہ کے حالات سے بے خبر نہ تھی۔ ارادہ کرتی تھی کہ خود جائے اور سمجھائے مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ وہ جانتی تھی۔ جاؤنگی۔

سمجھانے کم آؤں گی رنجیدہ۔ لیکن ماں تھی اس حالت کو سُن سُن کر کلیجہ کٹتا تھا۔
آخر اُس نے یہ خط بیٹی کو لکھا:۔

"بیٹی شاہدہ کو ماں کی طرف سے بہت بہت دُعا۔

بچّہ کی موت کا جو اثر تم پر ہوا وہ صحیح، اور جو حالت تمہاری ہوئی وہ درست، تم اس صدمہ میں جو کہو وہ بجا اور جو کرو وہ جائز۔ مگر یہ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، قُدرت کے ادنیٰ کرشمے اور دُنیا کے معمولی کھیل ہیں۔ معاملہ خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم کا، اور مقابلہ زبردست اور کمزور، شیر اور بکری کا ہے۔ قطرے کا اکڑنا دریا کے سامنے۔ پَر کا پھیلنا پہاڑ کے روبرو۔ حماقت اور لغویت کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ قُدرت کا فیصلہ، خالق کا انتظام، عالم کا نظام، بے معنی نہیں کچھ وقعت اور حقیقت رکھتا ہے۔ مجبور کے مقابلہ میں اختیار، کمزور کے سامنے طاقت، مفلس کے روبرو دولت، اگر دماغ صحیح اور رائے صائب ہو تو اس زبردست ہستی کا پتہ دیں گے جس کی سلطنت اور حکومت ابدی اور ازلی ہے۔ یہ امتیاز یہ برتری اگر خیال درست اور قیاس معقول ہے تو پتہ دیں گے اور دکھا دیں گے کہ عزّت میں ذلّت اور دولت میں نکبت پوشیدہ اور پنہاں ہیں کمزور ہستیاں مظلوم صورتیں اور معصوم انسان۔ اگر نظر وسیع اور آنکھ گہری ہو تو ہانکے پکارے علی الاعلان اور بآواز بلند فنا کے نعرے اور انقلاب کے نغمے لگا اور گا رہے ہیں چمن کا ہر پھول، پھول کی ہر پنکھڑی، بہار کا موسم، موسم کا ہر ذرّہ، خوشی کی گھڑی، گھڑی کا ہر لمحہ، خزاں اور بربادی رنج اور مصیبت کا پیام ہے۔ کاش رہی ہو جو بچکیں اور

لے رہی ہو جو دے دیا۔ غریبوں کی آہ، یتیموں کا نالہ، بیوہ کی فریاد خالی جانے والی نہیں۔ ان مظالم کی انتہا اور ان زیادتیوں کی حد ہے۔ کیا تم کو وہ وقت یاد نہیں جب تمہارے ہاتھوں ایک بڑھیا ماما۔ ایک معصوم بچی رحیمًا اور منیرًا دونوں پھوپھی بھتیجیاں حوالات میں پہنچیں، اور رات کے بارہ گھنٹے اس کواری لڑکی نے جو تمہارے گھر پر تمہاری دہلیز پر ڈولی میں بیٹھ کر آئی، اور سر پر قسم اوڑھ کر اتری، سپاہیوں کی گالیوں اور ظالموں کی جھڑکیوں میں گذار دیے! تمہارے دونوں شکار ظالموں کے پنجہ میں تھے رات ان کے سر پر تھی اور بیکسیوں کا وارث کوئی نہ تھا! وہ تمہاری نگاہ میں تمہاری رائے میں مجبور بے بس جو کچھ بھی ہوں، مگر ان کے سر پر ایک وارث تھا، ایک مالک تھا، ایک حاکم تھا، وہ جس کی عزت تم سے زیادہ، جس کی طاقت تم سے بڑی، اور جس کی حکومت تم سے وسیع۔

میں اس خیال سے اس وقت بھی کانپی اور اب بھی کانپ رہی ہوں کہ بستی کا بچہ پچھلروا سا لال، کلیجہ کا ٹکڑا، ماں کی گود سے چھٹا ہوا، تمہارے جفاکار ہاتھوں نامعقول حکموں اور خود غرض ترکیبوں سے کیسی مصیبت میں پھنسا۔ بانچہ کی صورت کو ترستی رہ گئی اور بچہ کی آواز کو پھڑکتا نکال دیا گیا۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہارے دل پر تمہاری طبیعت پر، تمہارے دماغ پر اس کا رتی بھر اثر نہ ہوا مگر اس ظلم کا انجام، اس سختی کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ خدا کا فیصلہ خاموش اور اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ تم کو آج معلوم ہوگیا کہ مامتا کیا ہوتی ہے اور بستی کے دل پر کیا گذری ہوگی اور اس کا کلیجہ کس طرح کٹا ہوگا نکلو

خدا نے دکھایا اور دنیا نے بتا دیا کہ جس کا کوئی نہیں اس کا بھی
کوئی ہے اور جو بظاہر کچھ نہیں وہ درحقیقت کچھ ہے۔
دنیا نے تمہاری عقل پر اور زندگی نے تمہاری آنکھ پر نخوت اور
تمکنت کے پردے ڈال دیے اور تم اس خدا سے جو عزت والا، حشمت
والا، طاقت والا، قدرت والا ہے ایسی فرنٹ، اتنی بیزار اور اس قدر
متنفر ہو گئیں کہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ طاقت رہنے
والی اور یہ دولت ٹکنے والی نہیں۔ حکومت عارضی اور دولت فانی
ہے۔ جوانی مہمان اور طاقت چند روزہ۔ صحت کے ساتھ علالت، دولت
کے ساتھ افلاس۔ خوشی کے ساتھ غم اور آزادی کے ساتھ قید وابستہ ہیں۔
کبھی سوچو اور غور کرو کہ رحیما پر کیا گذری۔ منیرا پر کیا بیتی، بسنتی کیا
بیتی اور شریف کیا کہتا ہوگا۔ میں کہتی ہوں اور محبت سے کہ یہ وطیرہ
غلط، یہ راستہ ٹیڑھا اور یہ لچھن اچھے نہیں۔ شاہدہ! ڈر اس خدا سے
جو حاکم حقیقی ہے اور لرز ان روحوں سے جو کڑھ کر رلا رہی ہیں۔ بچہ معصوم
تھا بھگت گیا جو بھگتنی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا کچھ نہ تھا۔ دنیا کی مصیبتیں،
زندگی کی اذیتیں ابھی بہت ہیں۔ سنبھل اور گر سجدے میں اس کے آگے جو
بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور گڑگڑا اس کے حضور میں جو مالکوں کا مالک ہے
کٹر دل کو مار، ظالم غصہ کو مسل، نخوت کو غارت اور خودبینی کو دور کر، چل
اس رستہ پر جو سیدھا اور اس ڈگر پر جو صاف ہے۔ وقت باقی ہے اور توبہ
موجود۔ گڑگڑا ندامت کے آنسوؤں سے۔ رو شرمندگی کی التجاؤں سے
جا اپنے قدموں سے۔ گر اپنی آنکھوں سے۔ جھک اپنے سر سے ننھیا
کے آگے۔ منیرا کے روبرو اور بسنتی کے سامنے۔

شاہدہ! گود میں اٹھا کلیجے سے لگا یتیم شریف کو جو تیرے حکم سے بچھڑا اور خدا کے حکم سے ملا۔

نواں باب

زاہدہ کی طرف سے تو باپ اس قدر غافل اور اتنا الگ تھلگ تھا کہ کبھی بھول کر بھی اس کی شادی کا اُس کو خیال نہ آیا۔ ماں البتہ اس رنج میں گھُلی جاتی تھی ایک آدھ دفعہ میاں کے منہ پر کہا بھی۔ مگر اس بھلے مانس نے اس کان سُنا اور اس کان اڑا دیا اور اگر کبھی بہت ہی مہربان ہوا اور بیوی کی پریشانی کو قابل لحاظ اور سوال کو لائق جواب سمجھا تو اتنا کہہ دیا "مجھ سے صلاح یا مشورہ تو درکنار میرے سامنے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جو میری بیٹی تھی اس کا میں نے کر دیا۔ اب یہ تمہاری بیٹی ہے۔ جہاں جی چاہے کرو اور جس طرح دل چاہے انجام دو۔ نکاح کے وقت شریک ضرور ہو جاؤں گا۔ جو لڑکے میرے علم میں ہیں یا جن کو پسند کرتا ہوں یہ بدنصیب ان کے قابل نہیں، جو نالائق ہیں وہ ایسے ہی ٹٹ پونجیے ہوں گے میں سوچوں تو بیوقوف اور غور کروں تو دیوانہ"۔

بیٹی تو بہر حال بیاہنی تھی۔ میاں کی بے اعتنائی کا نتیجہ یہ تو ہو ہی نہ سکتا تھا کہ ماں زاہدہ کو عمر بھر کنوارا بٹھائے رکھتی۔ چاروں طرف تلا توپ مچائی۔ خدا خدا کر کے ایک برخدا لڑکا انٹرنس پاس اوسط درجہ کی آمدنی۔ سیدھے سادے لوگ جاہل مطلق نہ بالکل علامہ بہادر۔ میاں سے تذکرہ کیا مگر جب وہ تیوری پر بل ڈال کر خاموش رہا اور جواب نہ دیا تو ہاں کر لی اور تاریخ ٹھہر گئی۔ نکاح سے پانچ روز پہلے زاہدہ مایوں بیٹھی۔ شاہدہ حقیقی بہن تھی اور اس کی شرکت نہایت ضروری مگر اس لئے نہیں بلکہ دل لگی کرنے اور مضحکہ اُڑانے باپ نے بیٹی کو بلوا بھیجا۔ چنانچہ پہلے ہی روز کہ لڑکی کو مایوں بیٹھے چند گھنٹے گزرے ہوں گے

دونوں باپ بیٹیوں نے اس طرح نکتہ چینی شروع کی۔

شاہدہ ۔"کیوں اماں جان کیا بغیر باپوں کے نکاح جائز نہیں ہے"؟

باپ ۔"بیٹی تم کو نہیں معلوم یہ تو اسلام کا خاص حکم ہے"۔

شاہدہ ۔"اس سے اماں جان تو میرا نکاح تو ہوا ہی نہیں"۔

باپ ۔"ہاں بات تو ٹھیک ہے اپنی اماں سے سن ہی لو"۔

ماں تو ماں تھی ادھر نو بیٹی کی مفارقت کا اثر، اس پر شوہر کے کچوکے، اس پر ستم شاہدہ کا مضحکہ۔ اپنی طرف سے ہر چند ٹالا۔ بہت دیر تک خاموش رہی مگر جب یہ دیکھا کہ دونوں کے دونوں جان ہی کو آ گئے تو بیٹی سے تو نہ بولی۔ مگر شوہر سے کہا "اس میں شک نہیں کہ خدا نے تم کو اور تمہاری بچی کو ضرورت سے زیادہ عقل اور حد سے بڑھ کر علم دیا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمہارے سوا دنیا میں جتنے ہیں وہ جاہل اور بیوقوف۔ اگر اپنی قدیم روایات پر قائم رہنا اور بزرگوں کی تجاویز پر عمل کرنا جہالت ہے تو مجھ کو اس بیوقوفی پر ناز ہے۔ میں بیوقوف اچھی اور جاہل بہتر لیکن تمہاری عقل اور علم اس بیوقوفی اور جہالت کے مقابلہ میں شاید تمہارے واسطے مفید ہو تو ہو دوسروں کے واسطے تو سراسر ضرر اور یقینی تکلیف دہ ہے۔ میں آج بیس برس کی بیاہی ہوں بلکہ زیادہ، برابر کی دو لڑکیاں آ گئیں۔ نانی بن چکی۔ جوانی ختم اور بڑھاپا شروع ہے مگر آج تک کسی بزرگ کے سامنے تم سے ہنس کر بات نہ کی۔ تمہاری عقلمندی کا نتیجہ اور تعلیم کا انجام یہ ہے کہ تین برس کی بیاہی لڑکی تم باپ کے سامنے اپنے نکاح کا ذکر ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر کر رہی ہو۔ خدا مجھ کو یہ وقت نہ دکھائے کہ اپنے باپ کے سامنے ایسی بے غیرت بنوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہمارے ہاں اکثر رسمیں جو دوسروں سے لی گئیں اور بہت سی باتیں جو ادھر ادھر سے داخل ہو گئیں قابلِ لعنت اور لائق ملامت ہیں لیکن وہ طریقے اور وہ تدبیریں جو مرنے والے بزرگ دل عمروں کے تجربے اور بیسیوں برس کے غور و فکر

کے بعد چھوڑ گئے اُن پر مُنہ آنا اور بُرا بتانا کُھلی ہوئی غلطی ہے۔ بے غیرتی کا تو علاج نہیں مُنہ اپنا، زبان اپنی، جس کو جا ہو بُرا کہو جس کو چاہو بھلا۔ مگر بات کہو تو معقول اور کام کرو تو درست۔ یہ کیا جو مُنہ میں آیا وہ کہدیا۔ زور پر آئے تو پھُول کو پتھر اور سونے کو مٹی بنا دیا مایوں کی رسم جس کا خاکہ اُڑا رہے ہو قدامت کا جوہر ہے اگر سمجھتے اور غور کرتے تو نتیجہ یہ نہ ہوتا جو مشاہدہ کا ہوا۔

مایوں کی خوبیاں مجھ سے سُنو اور خود ہی فیصلہ کرو کہ یہ جو کچھ میں نے کیا بجا کیا، یا بجا۔ قربان جائیے ان پاک رُوحوں کے جو زندگی کے کیسے کیسے کٹھن رستے اور کیسی کیسی منزلیں اس خوبصورتی سے طے کرنی بتا گئیں۔

آجتک یہ تو تم بھی دیکھ رہے ہو کہ اگر شادی کا ذکر کبھی آجائے تو شریف بچیاں وہاں سے اُٹھ کر دُور چلی جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ حیا ایمان کا جزو ہے۔ وہ لڑکی جو چار روز بعد شوہر کے پہلو میں بیٹھنے والی ہے کس دل سے چار آدمیوں کے سامنے آنکھ ملا کر بات کرے۔ یا اپنے دل کی کیفیت دکھا کر اور اپنی حالت سُنا کر یہ بتادے کہ میں تو اس دن کو ترس رہی تھی۔

اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ ایمان ہے تو جہان ہے اور شرم ہے تو ایمان ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں شرم و حیا کی دیویاں ہوں کہئے یہ ہماری رسم ضروری ٹھہری یا نہیں؟

ہمارے ملک کا تمدن اس درجہ خراب اور ناقص ہو گیا ہے کہ شادی کے موقعہ پر چاروں طرف سے خواہ مخواہ کے فتنہ پرداز لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جن باتوں کا سر نہ پاؤں دل سے جوڑ کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوئی بیٹی والوں کو بھڑکانا اور کوئی بیٹے والوں کا بہکانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں۔ کہ لڑکی ان لغو اور لچر باتوں سے متاثر نہ ہو اور یہ فتنہ پرداز باتیں اس کے کان تک نہ پہنچیں۔

ایک کواری لڑکی جو پندرہ سولہ برس میکے میں رہی، اب اس گھر سے وداع ہوتی ہے اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بلکہ زندگی اب ہی شروع ہوتی ہے کیا وہ یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کو مہلت دیدی جائے کہ وہ تخلیہ میں بیٹھ کر اپنی آیندہ زندگی کے متعلق کچھ غور کرے اور طے کرے کہ اس کو آگے چلکر کیا کرنا اور کس طرح رہنا ہے؟

ماؤں کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ لڑکی کا رنگ روغن خوب نکلے اور اس کو اچھی خوراک دی جائے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے اس طرح سب کی آنکھ بچا کر؟

یہ میں نے نہایت مختصر طور پر تمہارے سامنے دو تین ہی باتیں بیان کی ہیں۔ مگر جب تم حیا کو عورت کے واسطے فضول سمجھتے ہو تو میں جھوٹی اور تم سچے"۔

میاں، بیوی کی بیوقوفی اور بیٹی ماں کی جہالت پر ہنستے اور ٹھٹھے لگاتے رہے یا نکاح کے وقت تک اعتراضوں کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر ماں نے مطلق پرواہ نہ کی اور اب زاہدہ بھی سسرال جا پہنچیں۔

دسواں باب

وداع کے دوسرے روز چالا تھا۔ شاہدہ اس رسم کو کس طرح جائز سمجھتی۔ اس لئے ماں کے سامنے باپ سے کہا۔

"بابا اب تک تو جو کچھ ہوا وہ ہوگیا۔ اماں جان کی ذات سے متعلق تھا اور اس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی پر پڑ رہا تھا۔ لیکن اب ان کے خیالات ایک دوسری زندگی سے واسطہ رکھتے ہیں یہ وداع کوئی نئی وداع نہیں ہے۔ میں بھی آخر بیاہی گئی تھی یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ دلہن کو گئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے اور طلبی کا تقاضا موجود! کچھ روز ان کو وہاں رہنے دیجئے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی عادت

خصلت خو بو سے واقف ہوں، اشد ضرورت ہے کہ آپ اس معاملہ میں دخل دیں اور دلہن کو ابھی نہ بلائیں"

باپ۔ "بیٹی آخر سُن تو تمہاری اماں بھی رہی ہیں۔ میں ہی اپنے مُنہ سے منع کرکے کیا لے لوں گا۔ میں نے تو شروع ہی سے اس کے معاملہ میں اسی واسطے دخل نہیں دیا جو ان کی سمجھ میں آیا وہ کیا۔ اب بھی دخل دینا نہیں چاہتا۔ جو ان کا جی چاہے کریں"۔

شاہدہ۔ "ماما آپ اتنی سی موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ شادی کے بعد میاں بیوی کو ساتھ رہنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کو آج بلالیں"۔

ما۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آباو اجداد کے وہ طریقے جو موجودہ زمانہ کی کسوٹی پر بھی پورے اُتر رہے ہیں میرے سر آنکھوں پر ہیں۔ مجھ کو میری بچی دوبھر نہیں کہ میں اُس کے شوہر کو اور ساس نندوں کو یہ یقین دلادوں کہ اس کا کوئی مراجعا والی وارث نہیں۔ لڑکی گھر کا کوڑا تھی کہ نکال باہر کیا۔ وہ درحقیقت کلیجہ کا ٹکڑا ہے اسکی شادی قانون فطرت تھی۔ پورا کر دیا۔ مگر جبتک ماباپ زندہ ہیں اس کے دُکھ، سُکھ، رنج، راحت سے غافل اور بے خبر نہیں اور ان کا فرض ہے کہ شوہر کو یہ یقین دلادیں کہ بیوی قیدی بنکر میرے قبضہ میں اور لونڈی بنکر میرے گھر میں نہیں آئی۔ یہ دُلہن جو اسوقت ہمارے گھر کی رونق ہے دوسری آنکھوں کی پتلی اور دوسرے دلوں کا سرور بھی ہے ہم کو یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ شوہر کے تعلقات سُسرال والوں کے برتاؤ اس کے ساتھ کیسے رہے۔ وہ ناتجربہ کار ہے بچّہ ہے اگر کسی معاملہ میں وہ صلاح کی محتاج ہو تو اپنے تجربہ سے واقعات سُنکر رائے دیں کہ جو گُتھی پڑگئی وہ کس طرح سُلجھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری بچیاں اتنی بے غیرت اور ایسی بے شرم نہیں کہ کہدو میاں منفح اور گھر سنبھالوں اپنا، دو گھنٹہ کی دُلہن اس گھر میں اور ان لوگوں میں جس کو اور جن کو پہلے دیکھا تک نہیں۔ دسترخوان پر بیٹھ رکابی صفاچٹ کردے اور حکم دے "اور لاؤ" دھڑلے

سے میاں کے سامنے ہڈیاں چھوڑے اور ساس نندوں کے روبرو منہ چیر چیر کر اور پھاڑ پھاڑ کر بوٹیاں چبائے۔ بیچاریاں کہنے سننے سے ایک آدھ لقمہ کھا سکتی ہیں۔ اس کو شرم کہو، حیا کہو، جدائی کا اثر۔ فراق کا نتیجہ، جو چاہے سمجھ لو۔ تم ایمان سے کہو کہ جب پالا پڑے اُن لوگوں سے جو ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت کو نگاہ میں رکھیں اور سابقہ ہو ان لوگوں سے جو کھانے پر، پینے پر، پہننے پر، اوڑھنے پر غرض ہر کام پر اور ہر بات پر رائے دیں اور خیال ظاہر کریں تو احتیاط ضروری ہے یا نہیں؟ ایمان نہ نگلو خدا کے واسطے یہ تو بتاؤ کہ مغرب جس کا کلمہ پڑھ رہے ہو کیا دولہن کو ساس نندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے؟ وہاں صرف میاں بیوی ہوتے ہیں مگر یہاں دولہا کے تمام عزیز، دوست بھی اور دشمن بھی۔

اس واسطے یہ چالوں کی رسم مقرر کی گئی جس کی بڑی مصلحت یہ بھی ہے۔ کہ دُلہن کے ساتھ، دولہا کے تعلقات بھی سسرال والوں سے بڑھنے شروع ہوں۔

میں نے ساری عمر میں تمہارے میاں کو دو یا تین مرتبہ دیکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ اس کو کیا خبر کہ مجھ کو اس کی محبت ہے بھی یا نہیں۔ حالانکہ ضرورت ہے اور اس لئے بیٹی دیکر بیٹا لیتے ہیں کہ ہم اس کو بھی بتا دیں کہ تیری محبت اپنی بچی سے کم نہیں۔ جس طرح نکاح نے ہماری بچی کو مادہی اسی طرح ہم کو بیٹا۔ تم ان باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو؟"

گیارھواں باب

زاہدہ کی شادی کو سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ دونوں ماباپ بچیوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ اختلاف مزاج کیوجہ سے نہیں اختلاف رائے کے سبب کبھی کبھار دونوں میں کچھ کھٹ پٹ سی ہو جاتی تھی ورنہ اس

نیک بی بی کا ضبط و تحمل اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتا اور جو کچھ بھی کہتا صبر سے دیکھتی اور شکر سے سنتی۔ میاں نے یہ کوشش ہمیشہ کی بلکہ عمر بھر کی کہ بیوی اسکی مرضی پر رہے اور صلاح پر کام کرے۔ مگر خرابی یہ تھی کہ جن باتوں کو وہ عیب سمجھتا تھا یہ ہنر اور جو اس کی نگاہ میں برائیاں تھیں اس کے خیال میں بھلائیاں کبھی کبھی ایسا ہوا کہ دونوں کسی خاص معاملہ پر بحث کر رہے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ وہ اپنی کہتا یہ اپنی۔ قایل وہ ہوتا نہ یہ۔

جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت انا منہیاری بغل میں ٹوکری لیے آئی۔ گھر والی صورت دیکھتے ہی کہنے لگی۔

" انا بوا سلام۔ کل سے دو دفعہ بلا چکی ہوں دیکھو تو سہی سونٹا سے ہاتھ پڑے ہیں"۔

انا بوا۔ "بیوی۔ کیا بتاؤں جب سے آنکھوں میں پانی اترا ہے صاف تو دکھائی دیتا نہیں۔ لکڑی کے سہارے چلتی ہوں۔ اب تمہاری صورت دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا آؤں۔ ٹھوکریں، دھکا ہے، بڑھاپے کے دن ٹیڑھا سودا۔ گر پڑوں تو چوٹ لگے سو الگ، نقصان ہو وہ جدا۔ اس لئے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تمہاری صاحبزادی کا تذکرہ دو دفعہ آیا۔ پرسوں وہاں گئی تھی۔ جاکر بھی پچھتائی۔ ان چوڑیوں سے تو ان کو نفرت ہی ہے۔ میرے منہ سے نکلا بیٹی تجھے ننگے ہاتھوں وہم بھی نہیں آتا۔ ارے بیوی وہ صاف بگڑ گئی اور کہنے لگی۔ وہم کس چیز کا۔ کیا شوہر کی موت اور زندگی چوڑیوں پر موقوف ہے۔ جیسی اللہ جیسی چوڑیاں پہنا گیا تھا ایسی ہوں تو پہنا دے جاؤ"۔ خیر میں نے چوڑیاں پہنا دیں۔ ہاتھ ماشاء اللہ پورا ہڈی دار پانچ ٹوٹیں جب دو چڑھیں، دو آنہ کی چوڑی دس آنہ گرہ سے دیکر چار آنہ کی بیچیں۔ انہوں نے پہلی ہی چوڑی پر کہہ دیا تھا۔ جو ٹوٹے وہ منہیاری کی۔ ادھر چوڑی چٹ ہوئی ادھر وہ

کھلکھلا کر ہنسیں۔ خیر میں جلتی رہی اور پہناتی۔ جب پہن پان چلنے لگیں تو ٹوکری دیکھ کہتی کیا ہیں یہ کانچ کی چوڑیاں پہننے والیاں بیوقوف ابھی زندہ ہیں" ۔ اس پر تو میرے آگ لگ گئی میں نے کہا "بیٹی زبان سنبھال کے بولو بیوقوف ہو گی تم۔ آپ جو اوروں کو بیوقوف بناتی ہو تم سمجھتی ہو ہم عقلمند ہیں، پڑھے لکھے ہیں وہ انگلیاں ماتھے پر رکھنی نصیب نہیں نہیں۔ اگلے زمانہ کے لوگ اس کو فرض سمجھتے تھے کہ لڑکی سرگندھوا کر اور چوڑیاں پہن کر ضرور سلام کرے ۔ اب یہ سلام قابل الزام ہے۔ مگر مجھے ذرا یہ بتا دو کہ پانی کا گاس لیکر دینے والے سے یہ کیوں کہتی ہو شکریہ ۔ بات کسی سے لیکر یہ کس لئے کہتی ہو تسلیم۔ بیٹی یہ وہی شکریہ تو ہے جو دینے والیوں نے اس طرح لڑکیوں کو بتایا تھا یہ ان ہی کے چبائے ہوئے نوالے اُلٹ پلٹ رہی ہو۔ تم مجھے ایک کہتیں نہ چار سُنتیں" ۔

میں تو یہ کہہ کر چلی آئی ۔ مگر اب انشاء اللہ نہ جاؤں گی ۔ سلام کرتیں تمہاری پاتیں میرا کیا لیا ۔ اپنا کچھ کھویا"۔

منہیاری شریف تھی یا رذیل ۔ مگر جو کچھ کہا اس انسانیت اور معقولیت سے کہ باپ جو چپکا بیٹھا سُن رہا تھا ۔ اس نے بھی شاھدہ کی یہ حرکت پسند نہ کی اور آج عمر بھر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بھی ایک معقول بات سوچی ۔ منہیاری چلی گئی تو بیوی سے کہا:-

" اتنا بھو بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی" ۔

بیوی " تم ہی دیکھو خدا معلوم کس قسم کی کمبخت طبیعت پائی ہے کہ کسی سے جُھکنا ہی نہیں آتا ۔ اسی پیٹ کی بچی زاھدہ ہے ۔ مگر دونوں کی طبیعت میں حالت میں عادت میں خصلت میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ اُس کا بس چلے تو کسی غریب فقیر کو دنیا میں رہنے تک نہ دے ۔

اس کے اختیار میں ہو تو اپنی کھال کی جوتیاں تک حاجت مندوں کو پہنا دے" ۔

میاں۔ "میں سال سال بھر سے تو یہ سُن رہا ہوں کہ شاھدہ نے اپنے اخراجات اس قدر بڑھا رکھے ہیں کہ آمدنی کافی نہیں ہوتی اور چاروں طرف سے قرضہ لینا پڑتا ہے اب یہ سُنا ہے کہ ہزار روپیہ کا ایک جوڑا تیار ہوا ہے۔ اور کپڑا بزاز سے اس شرط پر لیا گیا ہے کہ اگر تین مہینہ میں روپیہ ادا نہ ہو تو ہزار کے ڈیڑھ ہزار۔ ساس سسر نے بیٹے بہو کو اسی لئے الگ کر دیا ہے۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ حسن بھی بیوی کے ان گُنوں سے پریشان ہو گیا ہے اور اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے پہلی تاریخ کو کلب کا سالانہ جلسہ ہے اس کیلئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ زاھدہ سے میں ناخوش ہی ہوں مگر حق یہ ہے کہ اس لحاظ سے تو میں اسے پسند کرتا ہوں کہ وہ آمدنی سے خرچ بڑھنے نہیں دیتی اب تو شاید ترقی پر بدلی ہوئی ہے"۔

بیوی۔ "ہاں خدا کا شکر ہے۔ پہاڑ پر سو روپے ملیں گے۔ آج گئے ہوئے ساتواں روز ہوا مگر خط بھی نہیں۔ وہ تو میری طرف سے ایسی غافل ہے نہیں۔ کہہ گئی تھی پہنچتے ہی لکھوں گی۔ خبر نہیں کیا بات ہے۔ خدا خیر رکھے۔ شاھدہ کا کیا کہنا خدا ہی اس کی حالت درست کرے تو کرے۔ میں تو شروع ہی سے کہہ رہی ہوں کہ دیکھئے یہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے تم نے کبھی میری سُنی ہی نہیں۔ وہ قرض پر جاں فدا ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ مر جاؤں اور قرض نہ لوں"۔

میاں۔ "میں کل گیا تھا تو حسن بھی موجود تھے۔ مگر چپکے چپکے اور اُس کے رُکے جب وہ چلے گئے تو میں نے باتوں باتوں میں سُنا دیا کہ خرچ آمدنی کے اندر رہنا چاہیئے۔ مگر وہ کیا ایسی ننھی تھی فوراً سمجھ گئی اور کہنے لگی" ضروری خرچ تو کوئی بھی رُک نہیں سکتا منہ سے کہہ دینا آسان ہے۔ آدمی حساب کرے تو معلوم ہو کہ کونسا خرچ فالتو ہے۔ کپڑا نہ پہنے؟ کھانا نہ کھائے۔ آدمی نہ رکھے؟ گاڑی نہ رکھے؟ جتنی جان کے جو خرچ ہیں وہ تو دم ہی کیسا ختم ہو گئے مصیبت کی زندگی سے تو موت بہتر ہے جب ہاتھ

میں نہ ہوتی تو کہاں سے آ بیٹھے ہیں تو ان زندگیوں پر تعجب اور تعجب نہیں افسوس کرتی ہوں بلکہ لعنت بھیجتی ہوں جو عمر بھر مصیبتیں جھیلیں اور پاپڑ بیلیں کھائیں نہ پئیں اور جوڑ جوڑ کر دوسروں کے واسطے چھوڑ جائیں۔ مجھ سے اگر کوئی یہ توقع رکھے تو یقیناً غلطی ہے۔ اسی وجہ سے مسٹر حسن ناخوش ہیں لیکن ان کی ناخوشی اتنی بے موقعہ اور اس قدر غلط ہے کہ میں اس کی مطلق پروا نہیں کر سکتی اور ایک میں کیا کوئی معقول بیوی بھی نہیں کر سکتی وہ ہوں یا آپ اگر کوئی یہ چاہے کہ ان جاہل بڑی بوڑھیوں کی طرح جو تھوک لگا لگا کر روپیہ جوڑتی تھیں میں بھی کھانا پینا اور ملنا جلنا حرام کر دوں تو حاشا وکلا میں اس زندگی اور اس دنیا سے باز آئی۔ انسان دنیا میں مصیبت بھگتنے کو پیدا نہیں ہوا۔ دنیا ہمارے واسطے جنّت ہے اور یہ جس قدر سامان مسرّت ہیں یہ ہمارے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ بدنصیب ہیں وہ کمبخت جو اس قابل ہیں کہ ان اسباب سے فائدہ اٹھائیں مگر نہیں اٹھاتے۔ خدا ایسے ملعونوں کی صورت نہ دکھائے۔ ان سے سالقہ نہ ڈالے میں نے مسٹر حسن سے صاف صاف کہدیا ہے کہ وہ اگر اپنے فرض کے ادا کرنے میں غفلت کریں گے تو نتیجہ کے ذمہ دار خود ہوں گے"۔

بیگم میں تو یہ گفتگو سنکر سناٹے میں رہ گیا۔ ایک بات سرسری طور پر کہی تھی اس کے جواب میں قینچی کی طرح جو زبان چلنی شروع ہوئی ہے تو کسی طرح بند ہی نہ ہوئی"۔

بیوی غور سے میاں کی باتیں سُن رہی تھی اور بیچ بیچ میں ٹھنڈے سانس بھرتی جاتی تھی۔ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ باہر سے ماما نے لاکر خط دیا جس کو دیکھ کر میاں نے کہا۔ "لوزا ھدہ کا خط ہے"

بیوی۔ "پڑھو خدا اچھی رکھے"۔

میاں۔ "تمہارے نام کا ہے۔ تم ہی پڑھو"۔

میاں نے خط کھولا اور اس طرح پڑھنا شروع کیا۔

اماں جان کی خدمت میں بہت بہت آداب۔

آپ سے جدا ہو کر یہاں پہنچی۔ کس طرح بتاؤں کہ رستہ کیوں کر کٹا اور دل پر کیا گذری۔ آ ادھر رہی تھی اور دل آپکے پاس تھا۔ ابھی پہاڑ ہم سے کوسوں دور تھا کہ سڑک پر ہرے ہرے تناور درخت جڑ سے اکھڑے دکھائی دئے۔ خیال کیا کہ شاید آندھی آئی ہو۔ مگر ایک ہو دو ہوں ساری سڑک پر ادھر سے اُدھر تک درخت ہی درخت تھے۔

جب ہم آبادی کے قریب پہنچے تو اور مصیبت نظر آئی نہ آدم نہ آدمی زاد۔ مکانوں کا شہراؤ ہوا پڑا ہے۔ گاڑی والے نے کہا کہ صاحب کل شام کو یہ خبر سنی تھی کہ پہاڑ پر بھونچال آیا اور اس زور کا کہ تمام پہاڑ الٹ گیا۔ آگے بڑھے تو بیسیوں آدمی مکانوں کے نیچے دبے پڑے تھے۔ عورتیں مرد بچے بڈھے سب ہی تھے، کڑیل جوان، بڈھے پھونس، کچھ سسک رہے، کچھ بلک رہے۔ کیسا قیامت خیز منظر تھا جو ہم کو دیکھنا پڑا۔ معصوم بچے ماؤں کے کلیجے سے چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔ پہاڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ کسی کا پاؤں دکھائی دے رہا ہے کسی کی گردن، کہیں بچے کی ٹانگ ہے تو کہیں ماں کا سر۔

ایک موقعہ تو ایسا دیکھا کہ بیان نہیں کر سکتی۔ ہزاروں لاکھوں من کا ایک ٹکڑا ایک عورت کی ٹانگ پر پڑا تھا۔ تڑپ رہی تھی۔ مگر دم نہ نکلتا تھا۔ ہم کو دیکھ کر ہاتھ جوڑنے لگی۔ کیا بتاؤں اس وقت دل کی حالت کیا تھی۔ ابتک وہ تصویر آنکھ کے سامنے ہے ہم چار آدمی تھے مگر چار کیا ہزار بھی ہوتے تو اس کو سرکا نہ سکتے تھے۔ مجھ کو پاس بلایا اور

کہنے لگی "وہ سامنے مٹی میں میرا صندوق ہے۔ کگر دکھائی دے رہی ہے
اس میں دو ہزار روپے کا زیور ہے۔ یہ میری بچی کو دیدینا"۔ میں کیا
جواب دیتی۔ کہنے لگی "پانی پلا دو"۔ ہمارے ساتھ صراحی تھی میں نے
پانی پلایا۔ کوئی دو گھنٹے تک ہم وہاں کھڑے رہے اور ہماری آنکھوں کے
سامنے اس کا دم نکل گیا۔ میں نے صندوق نکلوایا کھولا تو واقعی میں
زیور موجود تھا۔ آگے بڑھے تو ایک محلہ میں البتہ کچھ آدمی زندہ موجود
تھے۔ مگر یہ بھی مردوں سے بدتر تھے۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا کولہ اترا،
کوئی رو رہا تھا، کوئی چیخ رہا تھا۔ آگے کے محلہ میں آدمی زیادہ بھی تھے
اور زخمی بھی اتنے نہیں۔ مگر کچھ ایسا سہم چڑھا تھا کہ بات تک نہ کر سکتے تھے
گنتی کے کچھ مکان اور بچے مگر وہ بھی اس حال میں کہ حالت دیکھ کر کلیجہ
منہ کو آتا تھا۔ مکان رہنے والوں کا اور رہنے والے مرنے والوں کا کہرام
مچا رہے تھے پہلے ارادہ کیا کہ الٹے لوٹ چلیں۔ مگر شام کے قریب کاری
فوج آگئی ذرا اطمینان ہوا اور ہم ایک مکان میں اتر گئے۔

عشا کی نماز پڑھ رہی تھی کہ ایک عورت دیوانہ وار اندر آئی اور چاروں
طرف دیکھنے لگی اور کہنے لگی "بیوی اپنے بچوں کا صدقہ میرے دونوں بچے
دیدو"۔ میں متحیر تھی کہ کیا جواب دوں کہ وہ میرے قدموں میں گر پڑی اور
کہا "میرا جوان شیرا گلے برس مجھ سے بچھڑ چکا ہے اب مجھ رانڈ دکھیاری
کے یہ دو نو پھونسڑے ہیں۔ اور میری زندگی ان ہی دونوں سے ہے میری
مامتا ٹھنڈی کر دو۔ دل ان صورتوں کو ترس رہا ہے۔ اے بی بی میرے
بچے ملا دے۔ بھول والی میرے بچے دکھا دے۔ میرے کلیجہ کے ٹکڑے
میرے سینہ سے چمٹا دے۔ میری آنکھوں کے تارے لا اپنی جوانی کا

صدقہ میری چار سال کی کمائی۔ میری ایک برس کی محنت، میں ہاتھ جوڑتی ہوں، قدموں پر سر رکھتی ہوں۔ غریب ہوں بے وارثی ہوں"۔
اس کی گفتگو سنکر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اس کو بٹھایا کھانا دیا پانی دیا۔ ذرا عقل ٹھکانے ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دونوں بچے بھی دب کر زمین کے اندر پہنچ گئے ہیں۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ اس زیور کا کیا کروں۔ مردہ کی وصیت، کنبا کا مال، ایک ایک سے پوچھ چکی کہ کون تھی کیا تھی۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سہم سے آگئے ہیں تو سب کچھ بھول گئی۔ اس کی بچی کو کدھر ڈھونڈوں اور کہاں سے لاؤں کہ اس بار سے سبکدوش ہوں۔ یونہی تمام کام چھم کئے ہیں یہ بیٹھے بٹھائے میرے اعمال کی اور سزا ملی! آپ مولوی صاحب سے دریافت کیجئے کہ یہ زیور کس کو دوں؟ اگر کل کلاں کو اسکی بچی کا پتہ چل گیا تو کیا کرونگی؟ فقط اتنا تو معلوم ہوا ہے کہ مرنے والی کے میاں یہاں جانوروں کے ڈاکٹر تھے اور شاہجہاں پور کے رہنے والے اچھی میری اماں جان کسی کو شاہجہاں پور بھیج دیجئے۔ شاید کچھ پتہ چلے۔ ثواب کا کام ہے۔ آنے جانے کا کرایہ وہاں کا خرچ سب میں دوں گی۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ تکلیف گوارا کرے تو عمر بھر احسان مانوں گی۔

اب یہاں اللہ کا شکر ہے کوئی کھٹکا نہیں سرکار کی طرف سے سب انتظام ہو گئے ہیں پھر بھی مصیبت ماروں کا کیا حال سناؤں برابر میں جو منشی جی بیٹھتے ہیں ان کی بیوی اور بہت سے تین بچے ہیں بکل سلامت وہم۔ مگر بیتابوں کے ساتھ زخمی کسی میں اتنا سکت نہیں کہ

مل کر بھی پانی پی سکے۔ میں دونوں وقت جا کر ان کے ہاں کا سارا کام کر دیتی ہوں۔ ان کے ہاں سے فارغ ہو کر اپنا کام کرتی ہوں اماں جان میرے کیا ہاتھ پاؤں گھس جاتے ہیں خبر نہیں اللہ کو کونسی ادا پسند آجائے اور اسی بہانے مغفرت ہو جائے۔

میری دعا، گنج العرش اور چھوٹی حمائل وہیں رہ گئی ہے۔ یہ بھجوا دیجئے۔ ابا جان کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کر دیجئے۔

آپ کی لونڈی

زاہدہ

خط باپ پڑھ رہا تھا اور ماں سن رہی۔ مگر جس طرح دونوں کی طبیعت میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ اسی طرح حالت میں بھی۔ باپ نے ہنس ہنس کر پڑھا اور ماں نے رو رو کر سنا۔ وہ تو خط پڑھ بیوی کے آگے ڈال، رونا چھوڑ، ہنستا چل دیا۔ مگر یہ اٹھی وضو کیا دو نفل شکرانے کے پڑھے کہ خیریت کا خط آیا ایک دفعہ پھر کھولا اور پڑھا اور سوچنے لگی کہ شاہجہاں پور کس کو بھیجوں اور میرے کہنے سے کوئی جانے کیوں لگا۔ پرائے کارن، بلا وجہ، بلا سبب، کوئی تکلیف اٹھائے تو کیوں اور میں اذیت دوں تو کس لئے؟ چلو اماں جان سے کہوں شاید وہ کچھ انتظام کر دیں یہ فیصلہ کر خط ہاتھ میں لے، ڈولی منگوا میکے پہنچی اور وہاں کچھ تجویز کر کرا بیٹی کو یہ خط لکھا۔

نور چشمی سلمہا!

دعا۔ سخت تشویش اور بے حد انتظار کے بعد کل تمہارا خط پہنچا۔ تمہارے باپ نے پڑھا اور میں نے سنا۔ رنج بھی ہوا اور خوشی بھی۔ صدمہ بھی

اور اطمینان بھی۔ ان ہزارہا بندگانِ خدا کی کیفیت پڑھ کر جن پر خدا کا
یہ عذاب نازل ہوا، دل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر جس صداقت
کے ساتھ اس مصیبت میں تم مخلوقِ خدا کے کام آ رہی ہو اور اپنی راتیں
اپنا سکھ اور اپنی ضرورتیں دوسروں کے آرام ان کی آسائش اور ان کی
خواہشوں پر قربان کر رہی ہو یہ اسلام کا خاص منشا اور مسلمان کا عین
شیوہ ہے۔ خوش نصیب ہوں میں ماں جس کے پیٹ سے تم جیسی بچی پیدا
ہوئی اور تعریف کے قابل ہو وہ باپ جس کی نسل میں ایسی لڑکی ظہور میں آئی۔
اپنے ذاتی رنج و راحت سے ہر انسان بلکہ انسان کیا جانور تک متاثر ہوتا
ہے۔ مگر انسانیت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی تکلیف سے
زیادہ اور اپنی خوشی سے بڑھ کر دوسرے کی تکلیف اور دوسرے کی
خوشی کو سمجھے۔ مدد دے جو امکان میں ہو اور خدمت کرے جو ہو سکے۔
خدا کے نیک بندے اور خالق کی اچھی مخلوق وہی ہے جو بندوں کا غلام
اور مخلوق کا خدمتگار ہو۔ تم نے اس غضب میں اور اس آفت میں بہت
کچھ کیا۔ لے لیا اور پیدا کر لیا۔ کیا ان مظلوموں کی دعا اور ان بیچاروں کی
التجا خالی نہ جائیگی جو تمہارے ہاتھ کی دونوں وقت پکی پکائی کھا رہی ہیں۔
ان کی دعا وہ دعا ہے جس کے مقابلہ میں اور ان کی التجا وہ التجا ہے جس کے
سامنے امراء کی دولت اور بادشاہوں کی سلطنت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔
کئے جاؤ۔ جو کر سکتی ہو اور کرتی رہنا جو ہو سکے۔

شاہجہانپور میں نے آدمی بھیجدیا۔ خدا کرے سراغ لگ جائے۔ معاملہ ٹیڑھا
اور امانت پیچیدہ ہو گئی مگر جس خدا کے بھروسے پر کام شروع کیا ہے وہی ختم
کر دے گا۔

دعاگو
تمہاری ماں

بارہواں باب

شاہدہ۔ "میں اگر ایک ایک کر کے جہالت کی بیہودگیوں کو گنواؤں تو شاید تین چار دن میں بھی ختم نہ ہوں لیکن موٹی موٹی باتیں اگر ماما تم غور سے دیکھو تو صاف معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ اور یہ خیال صریح غلطی اور کھلی ہوئی بے وقوفی ہے۔ کیا مذہب نے آپ کو یہی بتایا کہ "مسافر سدھارا ہے جھاڑو نہ دو"۔

کیا اسلام اسی کا نام ہے کہ "شام کو دونوں وقت ملتے ہرے درخت کے نیچے کھڑی نہ ہو"۔

"سر کھول کر نہ بیٹھو"۔

کیا مسلمانوں کا فرض ہے کہ "پردیسی کے سامنے جب وہ سفر سے آیا ہو ول ضرور رکھیں"۔

کیا یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ "پانی کھڑے ہو کر نہیں تو چالیس دن کا رزق اٹھ جائے گا"۔

اور "ٹانگیں ہلا کر کھانے سے رزق کی برکت ختم ہو جائے گی"۔

افسوس افسوس کیا آپ اس میں بڑی خوبی دیکھتی ہیں کہ "جس عورت کے بچے مرجائیں وہ نہا کر اٹھے تو گلے نہ ملے اس کا لنج لگ جائیگا"۔

ماما کیوں کر یقین آگیا کہ "روٹی سے پیاز کھانی منحوس"۔

"چارپائی کی پائنتی اونچی ہونی منحوس"۔

"عورت کے سفید کپڑے منحوس"۔

کس کس کو دہراؤں۔ ماما آپ کی دنیا تو ان لغویات سے پُر ہے۔ آدمی کیا ہوا [illegible]

ہوگیا کہ سب باتیں اسی کے اختیار میں ہوگئیں۔

"بچہ کو نہلایا کالا دانہ جلادو نظر نہ لگ جائے"۔

مولود شریف ہے۔ اگر لوبان سلگادو مُردوں کی روحیں آئیں گی"۔

"ننگے سر جھاڑو نہ دو"۔

"انگلی چھوڑ کر کھانا نہ کھاؤ"۔

ماما مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ تعلیم جدید نے اب یہ لغویت ہم سے دور کرنی شروع کی ہے۔ اور اس قسم کی جہالت اب آپ کو اپنی بہنوں میں بہت کم نظر آئے گی۔ آپ فرمارہی ہیں کہ میں "گیلے بال نہ سوؤں" یعنی اسوقت کہ نہا کر اٹھی ہوں ابھی کنگھی کروں۔ اور وہ بھی اُلٹے سیدھے بال بنیں یا نہ بنیں مگر کسی طرح سمٹ جائیں۔ ماما اگر بال کھولکر سونا منحوس ہے اور غالباً منحوس ہی ہوگا جو آپ منع کررہی ہیں تو ایک بات تو بتایئے۔ یہ فقیرنیاں تو بڑی بھاگوان ہوتی ہوں گی جن کو برسوں بھی بال کھولنے کی نوبت نہیں آتی۔

پاپا کی یہ ہمیشہ کوشش رہی ہیں نے بارہا چاہا کہ آپ ان پرانے ڈھکوسلوں سے چھٹکارا پاکر ان خیالات پر آجائیں جن کی صداقت آئینہ کی طرح چمک رہی ہے۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کیا ہم معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہم ان پرانی نیک بختوں سے جنکی قوم محلہ یا اڑوس پڑوس کے دو ایک گھروں تک محدود تھی بہت زیادہ قوم کی خدمت کررہے ہیں۔ ہم جس طرح اس شہر کے ہر مسلمان کو اپنا سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں سے ہزاروں لاکھوں کوس کے رہنے بسنے والے مسلمان کو بھی بہن بھائی خیال کرتے ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجیئے کہ ہماری کوشش قوم کیواسطے کس قدر مفید ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں ہمارے کلب میں ہفتہ وار جلسے ہورہے ہیں۔ قوم کی نکبت و افلاس پر کس توجہ سے غور کیا جارہا ہے۔ دونوں مدرسے جو قائم کیئے گئے کس خوبی سے اپنے فرائض ادا کررہے ہیں۔ سوتے اُوپر

لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ یہ لڑکیاں جس وقت پڑھ لکھ کر نکلیں گی آپ ہی فرمایئے کیسی مائیں اور کیسی بیویاں ہوں گی"۔

ماں۔" بیٹی مجھے تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی رائے پر قائم رہو میں اپنی پر۔ مجھے تمہارے معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہ تم کو میرے۔ تمہاری کوششیں اگر قوم کے واسطے مفید ہیں تو خوشی کی بات ہے۔ میں اگر قوم کے واسطے مضر ہوں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

بیٹی۔" یہ سب سے بڑی مصیبت ہے کہ جہالت آپ لوگوں کو ایمان کی بات نہیں کہنے دیتی۔ جو خیالات آپکے دماغ میں سما گئے ہیں اور جو مرض متعدی کی طرح آپکی گودوں سے دوسروں کو لگ رہے ہیں۔ آپ ان کی خرابیوں کی بھی قائل نہیں۔ جبتک ان کی بیخ کنی نہ ہو ہماری کوششیں بارآور نہیں ہوسکتیں"۔

ماں۔" اب یہ جہالت ختم ہو رہی ہے اور مجھ جیسی دس بیس بڑی بوڑھیاں باقی ہیں۔ اس کے بعد قوم پوری ترقی کرلے گی"۔

بیٹی۔" ایسا ہوتا تو پھر کیا کہنے تھے۔ بیشک اطمینان ہو جاتا۔ مگر خرابی تو یہی آکر پڑ گئی کہ یہ زہریلے خیالات آپ کے بعد بھی دنیا میں موجود رہیں گے۔ ایک بہن سمجھدار تھی کہ آپ کے پھندے میں نہ پھنسی۔ مگر دوسری بالکل آپ کا نمونہ ہے اس کے بچے ہو بہو ماں ہوں گے۔ اب فرمایئے آپ کے بعد جہالت کا خاتمہ کس طرح ہوا؟"

ماں۔" مایوس نہ ہو اسی طرح رفتہ رفتہ کمی ہوتی جائیگی اور وہ وقت بھی آجائے گا۔ جب ہم جیسی جاہل عورتوں کا وجود تمہاری اسلامی دنیا میں نہ ہوگا"۔

بیٹی۔" لیکن یہ کوشش کیوں نہ ہو کہ آپ ہی اپنے خیالات تبدیل کرلیں اور سمجھ لیں کہ آپ کے خیالات نے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچایا"۔

ماں۔" میں اس معاملہ میں تم سے گفتگو کرنی ہی نہیں چاہتی اور تم خواہ مخواہ سر

ہوئے جاتی ہو۔ مرنے والیاں سو بیوقوف اور تم ہزار عقلمندوں کی عقلمند سہی۔ بحث کی کیا ضرورت ہے"۔

بیٹی۔"اسی کی تو اشد ضرورت ہے۔کل کے جلسہ میں یہ ریزولیوشن پیش ہوا اور باتفاق پاس ہوگیا کہ ہر ممبر جہانتک اس کے امکان میں ہو عورتوں سے ان عقائد کو جو محض جاہلانہ ہیں اور جن کی بدولت قوم اس قدر تاراج و برباد ہورہی ہے زائل کرنے کی کوشش کرے ایسی حالت میں میرا فرض ہے کہ میں سب سے پہلے آپ ہی کی اصلاح کروں ضرر ظاہر ہے۔آپ اس پر اصرار کیوں کرتی ہیں۔کیا آپ اسلام کی دشمن ہیں۔اگر آپ ان کو اچھا سمجھتی ہیں تو مجھے بھی بتایئے"۔

ماں۔"اگر تم اس قابل ہوتیں اور اتنا ایمان تم میں موجود ہوتا تو رونا ہی کا ہے کا تھا۔یاد رکھو کہ اُن میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ وہ خدا کو جتنی قدرت والا کہتی تھیں اتنا ہی سمجھتی تھیں۔اُن کو ہر حال میں، ہر رنگ میں، ہر خوشی میں اور ہر رنج میں خدا دکھائی دیتا تھا۔سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں اس سے بڑی مصیبت نازل نہ ہوجائے۔حد سے زیادہ خوشی میں بھی یہ کھٹکا اُن کے دل سے رخصت ہوتا تھا کہ زبردست قدرت والا اس خوشی کو رنج سے نہ بدل دے۔کہنے کو تو ہم بھی اور تم بھی دونوں ہی خدا کو قادر و قدیر سمجھتے ہیں۔لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے قول سے عمل سے بات سے چیت سے یہ ثابت کریں کہ جو سمجھتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔

ابراھیم لودی جس وقت تختِ حکومت پر جلوہ گر تھا اگر یہ سمجھ لیتا کہ عزت کے ساتھ ذلت لگی ہوئی ہے اور عزت دینے والا ذلت بھی دے سکتا ہے تو اسکی ماں جیلخانہ سے باہر آکر ھمایوں کے قدموں میں گرتی ہوئی تاریخ کو ان الفاظ سے نہ لرزا دیتی کہ

"میں ابراھیم کی ماں ہوں"

اسی یقین کا نام مذہب ہے جس کو مرنے والیاں ہر شئے سے مقدم سمجھتی ہیں۔

اور اُن کی گھُٹی میں ڈالا جاتا تھا کہ وہ مذہب کی وقعت اور خدا کی عظمت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دیں۔ اس واسطے ان کیلئے جو تجویزیں کی گئیں وہ مذہب کے دائرہ میں، مذہب کے رنگ میں، یا یوں سمجھو اس سانچے میں ڈھال کر سامنے رکھدیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہم میں بہت سے نقص ہیں اور ان کی اصلاح یقیناً ضروری ہے۔ لیکن اس کیچڑ میں چند جوہر بھی ہیں جن کو تم مانا سمجھ رہی ہو۔ اور درحقیقت وہ کلیجہ سے لگانے کے قابل ہیں۔ یہ اصول جن پر تم معترض ہو بادن تولے اور پاؤ رتی کے ہیں۔ تمہاری نگاہ میں اگر مذہب کی کوئی وقعت، تمہارے دل میں خدا کا کچھ خوف، تمہارے دماغ میں اگر رتی بھر عقل، اور تم میں اگر برائے نام انسانیت، اور تھوڑی سی بھی نسوانیت ہوتی تو تم سمجھتیں کہ ان کی اصلیت کیا اور حقیقت کیسی ہے۔

"مسافر گیا ہے جھاڑو نہ دو" اس سے مذہب کا کیا واسطہ؟ مگر اس میں جہالت کی کیا بات ہے؟ جانے وقت چیز بست، اسباب بچھونا بیسیوں چیزیں باہر ہوتی ہیں۔ اگر یہ خیال نہ جما دیا جاتا اور جاتے ہی جھاڑو پھِر جاتی تو چھوٹی موٹی چیزیں جھاڑو میں کوڑے تک فوراً پہنچ جاتیں۔ شاید کوئی انگوٹھی چھلّا پتہ۔ بالی کا غذ پتر بھی غارت ہو جاتا۔ بتاؤ یہ احتیاط کیا بُری ہے؟

چلو آگے بڑھو" شام کے وقت ہرے درخت کے نیچے سر کھول کر نہ کھڑی ہو"۔ یہ تو موٹی سی بات ہے لڑکی بالیاں شام کے وقت سر گوندھتی ہیں اور جب دونوں وقت ملتے ہیں اسی وقت پرند بسیرا لیتے ہیں۔ اگر درخت پر جانور ہوئے جو زیادہ ہرے ہرے درخت پر بیٹھتے ہیں اور بیٹ کر دی تو گُندھا گندھایا سر برباد ہوا یا نہ ہوا؟ خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی اس میں جہالت کیا ہوئی؟

"مسافر کے واسطے چاول" کی جو کہتی ہو دل میں غور کرو اور خود ہی قائل ہو جاؤ۔ آدھی رات کو مسافر اُترا اور پہلے سے خبر بھی نہ تھی کہ کھانے کا انتظام ہو جاتا۔ فرض کر لو

مہمان امیر ہے میزبان غریب جس کے پاس پیسہ ہے نہ وقت پر انتظام کر سکتا ہے۔ رات آدھی ہے کچھ انتظام ہو بھی نہیں سکتا۔ میزبان کی غربت کو کس خوبصورتی سے ڈھانکا ہے کہ صرف چاول پکا کر سامنے رکھ دے۔ ایمان سے کہنا ایک معمولی سی بات نے کتنی خرابیوں کو دور کر دیا۔

پانی کھڑے ہو کر پینے کے نقصانات تو ظاہر ہیں۔ خود طب کی رو سے ثابت ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مضر ہے۔

اسی طرح پاؤں ہلا کر کھانے کی کیفیت ہے ضرورت ہے کہ آدمی اطمینان سے کھائے اور پیئے۔ تاکہ کھانا انگ لگے۔ اور جو مقصد اصلی ہے وہ پورا ہو نہ کہ اوراُلٹا کھانا زہر اور پانی تیر بن کر اترے۔

کاش تم کو خدا عقل دیتا اور سمجھتیں کہ عورت نہا کر اُٹھے تو اس لئے کہ اس کے بچے مر گئے یا مر گیا گلے نہ ملو۔ کتنی معقول تجویز ہے۔ بچوں کی شرط تو برائے نام ہے بہت کم ایسی اللہ کی بندیاں ہوں گی جن کا کوئی بچہ نہ مرا ہو۔ احتیاط دونوں کے واسطے ہے اور اس لئے ہر عورت ایسی حالت میں گلے ملتی ہوئی ہچکچائے گی۔ اب تم اس کی وجہ سنو۔ عورت کے بال نہانے کے بعد خشک نہیں ہوتے اور ان میں نچوڑنے کے بعد بھی پانی کے قطرے موجود رہتے ہیں اگر اس سے کوئی ملیگا یا کسی کو ملنا پڑیگا تو بیشک کپڑوں کے خراب ہونیکا احتمال ہے۔ تم ہی دیکھو کس قابلیت سے اس ضرورت کو پورا کیا اس برائی کا انسداد کیا کہ دونوں میں ایک کو نا گوار نہ ہو۔

"روٹی پر پیاز کھلی" تم ہی سمجھ لو بری ہے یا نہیں۔ پیاز کس قدر بو کی چیز ہے اس بہانہ سے اس کو پاس ہی نہ آنے دیا۔

"بھار پائی کی پائنتی خود ہی کھڑی کر کے دیکھ لو کیسی معلوم ہوتی ہے اگر اس کو منحوس کہہ کر یہ کہہ دیا تو کیا گناہ کیا۔

ہاں عورت کے سفید کپڑوں کی بحث ذرا ٹیڑھی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں غیروں کے دیکھا دیکھی سفید کپڑوں کے شوق میں مبتلا ہیں مگر جنہوں نے سہاگ کے واسطے رنگین لباس مخصوص کیا تھا ان کو بیوہ اور سہاگن میں امتیاز کی ضرورت تھی۔ تاکہ خدا کے حکم بیوہ کے نکاح کی تکمیل با آسانی ہو سکے اور بیوہ عورت دیکھ سکے کہ اس کا رنڈاپا با آسانی تمیز ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ خود اسلام عورت سے متوقع ہے کہ مردوں کی طرح ہاتھ کے ناخن سفید نہ رکھے، میں تسلیم کرتی ہوں کہ بعض مرد بھی اب سفید لباس پسند کرتے ہیں مگر کثرت ابھی ان ہی لوگوں کی ہے جو عورت کے رنگین لباس کو سفید پر ترجیح دیتے ہیں یہ سیر بھی دیکھو کہ جن کی نقل میں سفید لباس پسند کیا جاتا ہے وہ خود رنگوں کے دلدادہ ہیں۔

"بچہ کے کالے دانہ کی" رسم تمہاری سمجھ میں نہ آسکی۔ اس سے نظر گذر سے واسطہ نہ سہی مگر اس کا مقصد صرف ہوا کا صاف کرنا ہے کہ بچہ کی اردگرد ہوا آدمیوں کی کثرت سے خراب نہ ہو یہ ہی کیفیت مولود شریف یا اور مجلسوں کی ہے کہ وہاں آدمی زیادہ ہوتے ہیں ہوا خراب نہ ہونے پائے۔

"ننگے سر جھاڑو دینا کھلی ہوئی نادانی ہے کہ خاک سر میں جائیگی اور اگر سر گندھا ہوا ہے تو اور بھی بال برباد ہوں گے"۔

انگلی چھوڑ کر کھانا تم کو تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہو۔ میری آنکھوں کو تو زہر معلوم ہوتا ہے اور میں اس کو بہت بڑی بدتمیزی خیال کرتی ہوں۔

بیٹی ان باتوں پر تم لاکھ جہالت کے آوازے کس لو مگر ان کی تہ میں تمکو کھلتے ہوئے پھول دکھائی دیں گے۔ تم مدرسوں کی جو کہتی ہو تو بیوی جس قدر فیض تمہارے ان مدرسوں سے جاری ہوتا ہے۔ یہ مرنیوالی بیویوں کے ہر گھر سے جاری تھا مشکل سے کوئی معقول گھر ایسا ہوتا ہوگا جہاں ایک آدھ محلہ کی غریب لڑکی۔ پڑھنا۔ لکھنا نہ سیکھتی ہو۔ ہاں تم

یہ اعتراض کرسکتی ہو کہ وہ تعلیم صرف کلام اللہ رٹ لینے کی ہوتی ہے۔ مگر میری بیٹی میں تو آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بھی اس سے زیادہ نہیں دیکھتی کہ خط لکھ لیں اور پڑھ لیں تم نے نئی تعلیم پائی ہے اور میں اس نعمت سے محروم ہوں تمہارا جو جی چاہے خانہ داری کے حساب کتاب کے متعلق مجھ سے دریافت کرلو۔ پیسوں کا، روپوں کا، اشرفیوں کا، آٹے کا، گھی کا، گوشت ترکاری کا تم بھی شاید اتنا ہی حساب زبانی بتا سکوگی جتنا میں لیکن میں اگر تم سے یہ کہونگی کہ ذرا آیت الکرسی تو پڑھ کر سنا دو۔ تو بغلیں جھانکنے لگوگی۔ تمہارا گھر جس طرح رہتا ہے اور جو ہنر سلیقہ تمہارے گھر سے ٹپک رہا ہے۔ وہ مجھے بھی معلوم ہے۔ جاہل کے گھر سے اپنے تعلیم یافتہ گھر کا مقابلہ کرلو۔ اور فرق کا فیصلہ تم خود ہی کرلو۔ تمہارے ہاں ماما اگر کسی روز نہ آئے تو اللہ جانے گھر میں مکھیاں بھنکتی رہیں۔ میرے ہاں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے تم سے ایک آدھ ماما زیادہ ہی ہے۔ مگر میں جبتک اپنے ہاتھ سے جھاڑو نہ دوں مجھ کو چین نہیں پڑتا۔ تمکو شاید مہینوں بھی باورچی خانے کے جھانکنے کا اتفاق نہ ہوتا ہوگا۔ میں دونوں وقت تمہارے ابا کا سالن خود اپنے ہاتھ سے بگھارتی ہوں۔ اور اس کو اپنا فرض سمجھتی ہوں تمہارا جس معاملہ میں جی چاہے مجھ سے بحث کرلو۔ یہ تمہارے ابا بھی بیٹھے ہیں ان ہی پر فیصلہ رہا۔ میری آمدنی تمہاری آمدنی سے زیادہ نہیں اور میرا جائز خرچ تمہارے جائز خرچ سے دگنا۔ مگر خدا کا شکر ہے ایک پیسہ کی قرضدار نہیں۔ بلکہ تھوڑا بہت اللہ کا دیا وقت بے وقت کے واسطے میرے پاس نکل ہی آئیگا۔ بولئے جناب آپ بھی کچھ فرمایئے غلط کہتی ہوں یا صحیح؟

تیرہواں باب

وقت کی پوری رو، حکومت کا زبردست اثر مغربیت ہر ذی روح اور غیر ذی روح شخص اور شے سے ظاہر ہورہی تھی۔ حد یہ کہ زمین کی پیداوار اور ہوا کا کرہ بھی اسی رنگ میں شرابور تھا۔ اس زہر ہلاہل کا اثر اتنی ترقی کرگیا تھا کہ زمین سے پھول اگتا تھا تو

خوشبو سے محروم اور ہوا میں طائر چہکتا تھا تو نغمہ سے پاک۔ برقی اڑن کی طرح بے رفتار لمحہ بہ
لمحہ ترقی کر رہی تھی۔ زاہدہ کا شوہر احسان تھا تو بجہ سیدھا اور حد سے زیادہ سادہ مگر
وقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ آخر انسان تھا، دل بھی تھا آنکھیں بھی، دماغ بھی اور جوانی
بھی۔ عمر گذری اس طرح کہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنی اور بس، اس کے سوا
گھر سے نکلنا قسم اور سیر کو جانا گناہ۔ اب جو پہاڑ پہ پہنچا اور یہ چہل پہل کے جلوے دیکھے کہ
برف کے ٹکڑے عورتیں شوہروں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ کوئی برقع میں، کوئی ساڑھی میں
کوئی گاؤن میں اور کوئی پتلون میں، سبزہ پہ ٹہلتی پھر رہی ہیں۔ آنکھیں کھل گئیں۔ نیا نیا آیا تھا
اول تو آدمی سمجھے ہی نہیں اور جب ہو بھی گئے تو چھانٹ چھانٹ کر اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ
کر ملا۔ ان لوگوں سے جو پرانی چال اور دقیانوسی خیال کے تھے۔ مگر ایک ہی مہینہ بعد پہاڑ
کی ٹھنڈی ہوا لگی اور منظر دیکھے۔ ایک تو انسان اور پھر نوجوان، ذرہ ہو کہ کان میں آ گئے
ترقی کے نعرے، وجہ کیا اور سبب کیا کہ دنیا ترقی کرتی اور احسان نہ کرتا۔ اس احساس کا پہلا
نتیجہ اور اس کوشش کا پہلا انجام یہ تھا کہ جو بیوی اب تک نعمت اور امرت تھی وہ ذلت اور
حقارت کا شکار ہونے لگی۔ یہ تو نہ کر سکا اور کر سکتا بھی نہ تھا کہ ایک دم سے رسی توڑا الگ کھڑا
ہو جاتا ہاں اتنا ہونے لگا تھا کہ بعد مغرب کبھی گھر سے باہر نہ نکلنے والا آدمی ہفتہ میں دو مرتبہ اور
کبھی تین مرتبہ تماشہ میں پہنچنے لگا۔ نماز گذشتہ دار ہوئی۔ وظیفہ ختم ہوا۔ وہ تھا اور
سٹوری پارک۔ مدرسہ کی حاضری مجبوری ہوئی۔ تنخواہ اسی کی بدولت مل رہا تھا ورنہ اس کا
بس چلتا تو اس قطعہ زمین کو جو خود جنت تھا چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کیلئے نہ چھوڑتا۔
چاندنی راتوں میں جس وقت ترقی پارک کے ہر ذرہ زمین سے بر آمد ہوتی تو یہ آنکھیں روشن
ہو جاتیں۔ زاہدہ لاکھ بھولی اور سیدھی تھی۔ مگر میاں کا رنگ فوراً تاڑ لیا۔ لیکن کیا
کر سکتی تھی پردیس کا معاملہ اجنبی لوگ، کہتی کس سے اور پوچھتی کیا۔ ترقی کا پہلا زینہ بدظنی
اور رعونت ہے۔ احسان نے سب سے پہلے [illegible] کی زنجیر توڑ کر خیر کو شر سے بدلا اور حکم دیا کہ

بیوی گھر سے باہر نہ نکلے۔ زاھدہ میاں کے سامنے اور اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی شے
کو وقیع نہ سمجھتی تھی۔ یہ حکم سر آنکھوں پر رکھا مگر ہمسائی جس کا کھانا دونوں وقت جا کر پکاتی
تھی۔ اس حکم سے سخت مصیبت میں پھنس گئی اور تین چار دموں پر لڑکے کے فاقے گذرنے
لگے۔ بدنصیب دو نوکر رہ گئے تھے اسی حالت میں لڑکی لڑکا لی گھسٹتی گھسٹاتی دوپہر کو چلی
چلی دیا پھر گھر میں تیسرے پہر پہنچی۔ احسان آڑی ٹانگ نکالے حقہ کے کش لگا رہا
تھا کہ یہ آواز کان میں آئی "بیٹی اپنے ہاتھ پاؤں کا صدقہ میرے ہاں آکر نہیں اپنے ہی ہاں ڈال
دیا کر ہم دو تین روز سے ترس گئے۔ بچے بلبلا بلبلا کر روتے پھرتے ہیں۔ میرے پاس سوا دعا کے کیا
دھرا کیا ہے۔ خدا خوش رکھے گا۔ الٰہی بچی دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اس پردیس میں تیری
عنایت سے ہم مردوں میں جان ڈال دی اور ہم مرتوں کو جلا لیا۔ اوپر خدا اور نیچے تو میرے
اپاہج بچے، میرا لنگڑا شوہر، بیمار دکھی ہوئی آتما۔ تجھ کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اے بیگم
بھوک کی تکلیف سے چھٹکارا دلوا اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر۔"

احسان۔ "بس دوسرے کی بھی سنو ان کو اتنی فرصت کہاں"۔

عورت۔ "اچھا میاں خوش رہو"۔

احسان۔ "خوش رہنا اور ناخوش رہنا کیا صرف تمہارے ہی کہنے پر ہے"؟

عورت اتنا سنتے ہی پھر نہ بولی اور جن قدموں سے آئی تھی ان ہی قدموں سے
الٹی لوٹی۔ احسان کپڑے پہن، سگرٹ سلگا، چھڑی ہاتھ میں لے سیٹی بجاتے باہر گئے۔
مگر زاھدہ کے کلیجہ پر جو چوٹ عورت کے بیان سے لگی تھی وہ اتنی گہری تھی کہ اسکی
آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے ہمسائی کو آواز دی اور کہا "آٹا بھیجو"، خود نماز پڑھی
اور دعا مانگی کہ "الٰہی اگر بری لگی ہو تو معاف کیجیو اور احسان کو اپنے حفظ و امان میں رکھیو"۔

میاں احسان کی ترقی کی کوشش زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ کئی دفعہ قصد کیا کہ عملی
صورت بھی اختیار کروں۔ مگر ہمت نہ پڑی آخر ایک دن جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ جلد آج

تم کو بھی تماشہ دکھلاؤں کیا یاد کرو گی"۔

احسان کی خواہش جائز تھی یا ناجائز یہ علیحدہ بحث ہے مگر سوال یہ ہے کہ بیوی بھی اس کی اہل تھی یا نہیں۔ بہرحال زاہدہ جیسی بیوی کو جس کی تعلیم یہ تھی کہ شوہر مجازی خدا ہے تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا احسان لے گیا اور وہ چلی گئی۔

صبح کو جب احسان سو کر اٹھا تو بیوی سے پوچھا :۔

"کہو تماشے کی بابت کیا رائے ہے کیسا رہا"؟

زاہدہ۔ "رائے کیا دوں، اچھا تھا"۔

احسان۔ "اچھا سے کام نہیں چلتا۔ تم اس کے فائدوں پر نظر ڈالو انسانی زندگی میں جو خرابیاں اور نقائص ہیں۔ ان کا اظہار کس خوبصورتی سے کیا گیا تھا وہ برائی کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ تم نے دیکھا شراب کا نتیجہ کس قابلیت سے دکھایا کہ پھر پینے کو جی نہیں چاہتا"۔

زاہدہ۔ "مگر جہاں بہت سی برائیوں سے دل ہٹ سکتا ہے وہاں بعض خرابیوں کی طرف طبیعت کے راغب ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ حسن و عشق کی داستان جو تمام تماشہ کی جان تھی بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو آجکل کے ناول۔ جس طرح اس قسم کی لغو کتابوں کا عورتوں کے ہاتھ میں دینا مضر ہے اسی طرح تماشہ بھی مفید نہیں"۔

احسان۔ "تو کیا تم دوبارہ جانا نہیں پسند کرتیں"؟

زاہدہ۔ "اگر تم کہو گے تو سر آنکھوں سے تعمیل کروں گی"۔

اس واقعہ کو مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ ایک روز احسان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ رات کے شاید آٹھ بجے ہوں گے کہ ہمسائی کی لڑکی نے آکر کہا :۔

"اماں ایک پان کا ٹکڑا مانگ رہی ہیں"۔ آج میاں احسان کو اپنا پرانا حکم یاد آگیا اور بیوی سے پوچھا "ابھی تک تمہارا یہ لغو سلسلہ برابر جاری ہے"؟

زاہدہ۔ "کس قسم کا سلسلہ"؟

احسان۔ "وہی روٹی پکانے کا"۔

زاہدہ۔ "تمہارے منع کرنے کے بعد کیوں کر ممکن تھا۔ میں نے اسی روز سے وہاں جانا بند کر دیا۔ اب وہ اپنا آٹا بھیج دیتی ہیں۔ میں یہیں پکا دیتی ہوں"۔

احسان۔ "مگر میں تو منع کر چکا تھا"؟

زاہدہ۔ "تم نے جس بات کو منع کیا تھا اس کی تعمیل ہوگئی۔ گو حکم تم نے کچھ نہیں دیا مگر تمہارے اس فقرے سے کہ ان کو اتنی فرصت کہاں میں یہ سمجھ گئی تھی کہ تمہاری مرضی نہیں۔ اس لئے میں نے جانا آنا بند کر دیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تمہارا یہ منشا ہے تو میں یہ بھی ختم کر دیتی"۔

احسان۔ "تمہارے بیان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تم اتنا تو سمجھ گئی تھیں کہ مجھے یہ سلسلہ پسند نہیں۔ تم کو ان کی خدمت میں کیا مصلحت دکھائی دی"۔

زاہدہ۔ "آیندہ یہ بھی نہ کروں گی"۔

احسان۔ "اب تک جو کیا"؟

زاہدہ۔ "غلطی ہوئی"۔

چودھواں باب

مسٹر حسن کی ذاتی آمدنی تو کچھ بھی نہیں، جو کچھ اللے تللے تھے وہ باپ کی کمائی اور جائداد کے برتے پر۔ بیوی پہلے تو میاں کو لیکر الگ ہو ئیں۔ اس کے بعد قرض شروع ہوا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو کچھ کہتا پاتا پاس نفاوہ اصل اور سود میں تمام ہوا۔ بیٹے اور بہو کا یہ انجام دیکھ کر باپ اور ماں دونوں رنجیدہ ہوئے۔ باپ کی یہ خفگی اگر حسن کا اپنی قوت بازو کا روپیہ ہوتا تو شاید میاں بیوی کی نگاہ میں زیادہ وقعت نہ رکھتی۔ مگر اب تو مصیبت

یہ آئی کہ خفگی فقط خفگی ہی تک محدود نہ رہی۔ بلکہ عمل میں بھی آ گئی اور دونوں نے
اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ خود ہوئے مفلس، قرضخواہوں کا ہوا تقاضا، چھکے چھوٹ
گئے۔ اب بیوی کے سامنے میاں اور میاں کے سامنے بیوی تھیں۔ وہ اس کو گنہگار
سمجھتا اور یہ اس کو۔ حسن پر یہ مصیبت پہاڑ کی طرح گری اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس تغیر
کا سبب، اس انقلاب کی وجہ، اس بربادی کا باعث، بیوی اور صرف بیوی ہے۔ ماں باپ اس کی
بدولت چھوٹے، قرض اس کے طفیل ہوا، تقاضے اس کے کارن ہوئے۔ یہ مانا کہ ترقی یافتہ
انسان تھا۔ مگر تھا انسان۔ محسوس کیا جو پڑی، اور سمجھا جو آئی۔ بیوی سے بارہا نرمی سے
اور سختی سے کہا بھی اور بتایا بھی کہ اب یہ پھپھن چھٹنے والے اور یہ ڈھنگ ٹکنے والے نہیں۔
ہاتھ روکو اور دل مارو۔ قرضخواہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے ایک ڈاکٹر کا خرچ وہ کر پیچھے
لگی ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی صحت اگر اس قدر روپیہ خرچ کرنے سے میسر آتی ہے تو
میری لئے بھی قدرت سے زیادہ ظالم کوئی طاقت نہیں" مگر بڑھا ہوا دل، بڑا ہوا لپکا، بیوی
کی سمجھ میں آتی کیا خاک اور سنتا کون کمبخت۔ حالت روز بروز ردی اور معاملہ ساعت
بہ ساعت خراب ہوتا گیا اور دن بھی آ پہنچے کہ قرضخواہوں کا تار صبح سے جو شروع ہوا تو
شام تک نہ ٹوٹا۔ واقعات کی اطلاع ماں باپ دونوں کو ہو رہی تھی انہوں نے حسن کو بارہا
متوجہ کیا اور وہ متوجہ ہوا۔ مگر شاہدہ کو متوجہ کرنے والا کون تھا یا ہوتا۔ اول تو اس قابل تھی
ہی نہیں۔ اگر کچھ تھی تو لے دے کر ایک باپ جو کچھ کہہ بھی سکتا اور کر بھی سکتا تھا۔ اور شروع
شروع میں دو ایک دفعہ کہا بھی۔ مگر دیکھا یہ کہ اس اللہ کی بندی نے اس کان سنا اور
اس کان اڑا دیا۔ تعمیل تو درکنار بحث پر تیار اور بگڑنے پر آمادہ ہو گئی تو چپکی سادھ لی۔
اور سمجھ لیا کہ جیسا کرے گی ویسا بھرے گی۔

وقت کی بات ہے ان ہی دنوں میں خانساماں کو تنفس کا دورہ ہوتا تھا۔ مگر
بڈھا آدمی پرانی آنکھیں دیکھا بھالا آتا اور لشتم پشتم پکاتا رہا۔ جب بخار آنے لگا تو مجبوراً آنا

چھوڑا۔ اب پکانے والا کوئی نہ تھا ایسا وقت تو یوں کٹا کہ بھرے اور مشعلچی نے مل جل کر کچھ
کر دیا مگر وہ کھانا کیا فقط نام کھانے کا تھا گوشت ہے وہ جلا ہوا۔ شوربا ہے وہ بساندا
رہے چاول وہ گالے بھی اور کچے بھی۔ شاہدہ نے کئی جگہ خط لکھے۔ دو ایک سے باتیں بھی
کہا۔ مگر بازار کی ترکاری یا گلی کا سودا نہ تھا کہ دام بھیجے اور منگوا لیا۔ دوسرے وقت شاہدہ
کو خود پکانا پڑا۔ یہ پہلا دن اور پہلا موقعہ تھا بھلا شاہدہ کی حیثیت کہ تین تین ہنڈیوں کا
مصالحہ پیسیں۔ بھرے کو دیا تو مرچیں ہلاہل اور مشعلچی سے کہا تو نمک زہر۔ خود پیسنے بیٹھیں مگر
جس کا کام اسی کو ساجھے۔ کہنیوں تک مرچیں لگ گئیں اور پھر بھی کھانا ڈھنگ کا نہ جڑا۔ اتنی
چار پانچ وقت یہی مصیبت رہی۔ شاہدہ سمجھ رہی تھی کہ میں نے میاں کو مول لے لیا اور وہ
احسان کیا کہ عمر بھر کان نہ ہلا سکے۔ دونوں وقت اس گرمی میں کہ آگ کی طرف دیکھا نہ جائے
کھانا پکا رہی ہوں مگر حسن خیال کر رہا ہے کہ ایسی عورت بھی کس کام کی جس کو کھانا تک پکانا
آتا ہو۔ شاہدہ جلی ہوئی حسن کھسا ہوا۔ دلوں میں غبار دونوں کے۔ وقت کی دیر اور موقعہ
کی ضرورت تھی کیفیت اسوقت دونوں کی یہ تھی کہ پھوڑا پکا پکایا تھا۔ نشتر دیا اور پھوٹا۔
شاید پانچواں روز تھا کہ حسن کھانا کھانے بیٹھا۔ شوربے کا پہلا ہی چمچہ لیا تو بکھرا سا لگا
اور شوربا دو دو لوٹے چھوڑ دیئے۔ چاولوں پر جھکا تو کچے۔ کباب کو چکھا تو پھیکا۔ کہنے لگا:۔

"یہ پانچ روز سے متواتر فاقے پڑ رہے ہیں اگر باورچی بیمار پڑ گیا تو اب بھوکا ہی مروں"

شاہدہ ۔" باورچی کی بیماری کی جس قدر میں نے دوا دارو کیا اسی قدر تم ۔ کچھ کے
اگر تم ہو تو میں بھی ہوں۔ افسوس ہے تمہاری طبیعت پر اور حد سے زیادہ تمہاری قدردانی
پر کہ آج پانچ روز سے میں خود سخت مصیبت اٹھا کر محض تمہارے واسطے چولہے
کے آگے مر رہی ہوں۔ بجائے اس کے کہ تم شکر کرتے اور الٹی شکایت کرتے ہو"۔

حسن ۔ " تم کیسی لغو باتیں بنا رہی ہو یہ تمہارا فرض ہے کسی پر احسان نہیں ہے
تمہاری ہر ضرورتیں پیش کیا کرتا ہوں۔ روپیہ تمہارے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ کیا تم پر احسان ہے؟"

اسی طرح اگر تم کھانے کا انتظام کرو۔ یا خود پکاؤ۔ یہ تمہارا فرض ہے اور ہونا چاہیئے"۔

شاہدہ۔" تو کیا بیویاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ وہ چولھے میں جھکیں اور بھاڑ میں جھنیں"۔

حسن۔" یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ اگر کھانا پکانا یا پکوانا ایسی سخت مصیبت ہے تو اس سے بہت زیادہ مصیبت کے کام مرد بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ عورتوں پر احسان کر رہے ہیں"۔

شاہدہ۔" تمہاری گفتگو ایسی تیز ہے کہ افسوس میں برداشت کے واسطے تیار نہیں"۔

حسن۔" تمہاری حالت اس قدر خراب ہے کہ مجھ میں اس سہار کی ہمت نہیں"۔

شاہدہ۔" اس کا فیصلہ یہ بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر خوش میں اپنے"۔

حسن۔" اگر یہی بہتر فیصلہ ہے تو سر آنکھوں پر"۔

شاہدہ۔" خیر مجھے زیادہ بحث کی ضرورت نہ فرصت"۔

(اتنا کہہ کر شاہدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرہ میں آ بیٹھی۔ سوچنے لگی کہ چھ چھ مہینہ سے حسن کا مزاج آسمان پر ہے۔ میرا کہیں جانا اسے ناگوار کسی سے ملنا اسے ناگوار۔ حد یہ ہے کہ میرا کپڑا، میرا خرچ، میرے نوکر چاکر کوئی بھی اسے گوارا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ شوہر ہے مگر خدا نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بیوی ہوں مگر لونڈی نہیں۔ حسن نے اپنے دل میں سمجھا کیا ہے۔ میں اسے وہ مزا چکھاؤں کہ عمر بھر یاد کرے۔ اس کا کیا قصور۔ قصور مسلمانوں کا ہے وہ بھی آخر مسلمان تھا مسلمان نکلا۔ سنتا ہے دیکھتا ہے کہ ہر عورت لونڈی اور ہر بیوی باندی۔ جب ہم اپنی حالت درست نہ کریں اور مردوں کو نہ بتا دیں کہ ہم بھی کچھ طاقت رکھتے ہیں تو شکایت فضول۔ اگر آج تمام مسلمان عورتیں یہ معاہدہ کر لیں

کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں مردوں کے ساتھ برابری کی حالت قائم رکھیں گی تو چار دن میں مردوں کے نکلے سکے سے بل نکل جاتے ہیں۔ خیر میں اس کا علاج کرتی ہوں اور ضرور ہے کہ خودکشی کرکے ایک ایسی مثال قائم کردوں کہ مرد آئندہ ہر عورت سے بات کرتے ہوئے تھرائیں۔ یقیناً میری موت بہنوں کے واسطے مفید ہوگی۔ مگر ہائیں اس سے حسن کا کیا بگڑے گا۔ وہ تو ہیں سے اپنا گھر بسا لیگا۔ اس کو عورتوں کی کیا کمی۔ مجھ کو اپنے طبقہ سے یہ اُمید نہیں کہ ہیں تو ان کے واسطے اپنی جان گنواؤں اور وہ صرف اتنا ہی انتظام کردیں کہ حسن کو بیوی نہ ملے۔ خدا سمجھے ان کمبخت مسلمانوں سے کوئی کام ہے آپ کرتے ہیں نہ دوسرے کو کرنے دیتے ہیں۔ نہیں تو یقیناً میرے ساتھ ہوں گی اور حسن کو بیٹی نہیں مل سکتی۔ مجھے اُمید ہے کہ اسکے سالانہ جلسہ میں یہ تجویز بھی منظور ہوسکتی ہے مگر بیٹی پر باپ کا بھی تو حق شرع اسلام نے لگا دیا ہے۔ سینکڑوں باپ شادی پر رضامند ہوجائیں گے۔ اور بل بل کرتے بیٹی دیں گے۔ خیر مرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے زندہ رہنا اور اس کو مزہ چکھانا چاہیئے۔ یہ ناممکن ہو کہ حسن میری زندگی میں دوسرا نکاح کرسکے۔ میں وہ مسلمان عورت نہیں کہ اس زہر کو ہنسی خوشی پی لوں۔ لیکن میرا اب اس کوٹھی میں رہنا کچھ ٹھیک نہیں۔"

اتنا کہہ کر شاردا نے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی اُٹھی "ضرور ضرور"۔

ایک چھوٹا سا تھیلا چمڑے کا ہاتھ میں اور بچہ کو ساتھ لے، برقع اُوڑھ، گھر کی گاڑی چھوڑ کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ، سیدھی کلب پہنچی۔ کچھ دیر ٹھہر کر اسٹیشن آئی اور ایک سہیلی سے ملنے دوسرے درجہ میں بیٹھ احمد آباد روانہ ہوئی۔ گاڑی کا ہندوستانی محافظ دیکھ تو بہت دیر سے رہا تھا۔ مگر اتنا سنتے ہی:—

"ہم کو پانی کی ضرورت ہے"

سہیلی کا ادا ہی تھا کہ لپکا اور فوراً پانی لے کر حاضر ہوا۔ شکریہ ادا ہوا۔ ایک آدھ بات بھی ہوئی۔

اور اب سلسلہ یہ شروع ہوا کہ جہاں گاڑی ٹھہرتی کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی ضرورت
سے آتا اور ایک آدھ بات پوچھ پاچھ چلا جاتا۔ شاہدہ کو اس سے پہلے میموں سے ملنے
کا اتفاق تو بہت ہوا تھا۔ اور وہ ان کے خلق کی بہت مداح تھی۔ مگر آج صاحب کے
اخلاق کی بھی داد دینی پڑی۔ جو "تھینک یو، تھینک یو" میں ادا ہو رہی تھی۔

صاحب کو بھی احمد آباد تک گاڑی کے ساتھ جانا تھا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ
شکار بھی وہیں جاتا ہے۔ اور یہ بے وارثی اپنی سہیلی مسز نصیر یوسف کے ہاں جاتی
ہے کہنے لگا۔ "آپ تو میری بہن ہیں"۔ مسز نصیر میری حقیقی بہن ہیں۔ اب آپ کو تار
دینے کی ضرورت نہیں۔ پروا نہ کیجئے۔ میں حاضر ہوں"۔

اب شاہدہ کو پورا اطمینان ہو گیا۔ احمد آباد پہنچ ٹرین سے اتر، گاڑی میں بیٹھ،
ایک مکان میں جا اتریں۔

شاہدہ۔ "برادر! اس گھر میں عورتیں مطلق نہیں۔ مسز نصیر کہاں ہیں؟"
برادر۔ "وہ ایک شادی میں گئی ہوئی ہیں۔ میں نے بلانے کو آدمی بھیجا ہے"۔
شاہدہ۔ "اوہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ برادر تھینک یو"۔
برادر۔ "نہیں نہیں سسٹر تکلیف کی کچھ بات نہیں"۔
شاہدہ۔ "مگر اور کوئی بھی یہاں نہ رہا۔ سب چلے گئے"۔
برادر۔ "حقیقی بھتیجے کی شادی ہے۔ وہ آجائیں تو پھر میں بھی جاؤں۔
دو روز کی چھٹی میں نے بھی اسی واسطے لی ہے۔ آپ غسل کر لیجئے۔ یہ سامنے غسل خانہ ہے۔
میں باہر چلا جاتا ہوں"۔

برادر باہر آ کر ٹہلنے لگے۔ دو تین گلاس پیے۔ شاہدہ اندر جا کر نہائیں۔ دو
جوڑے ساتھ تھے۔ کپڑے بدلے، بال درست کئے اور مسز نصیر کا انتظار کرنے لگیں۔
انوسر گارڈ کیسا ہی ہوشیار ہو، مگر شاہدہ بھی زیادہ بیوقوف عورت نہ تھی۔

آٹھ بجے گاڑی سے اُتری۔ جب رات کے گیارہ بج گئے اور اس نے دیکھا کہ خاوند کا پتہ نہیں۔ اور یہ کمبخت پیٹ پکڑے پکڑے پھر رہا ہے۔ تو یا تھا ٹھنکا۔ کچھ دیر ٹہلی اور سوچا۔ گھڑی دیکھی تو بارہ بجنے والے تھے۔ اب انور کا آنا لیکر آیا تو سب بازار کا شبہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کھانے نے شبہ کو یقین بنا دیا۔ انور کسی ضرورت سے باہر گیا وہ تین گلاس اور لائے۔ شاہدہ نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور جھٹ دروازہ بند کر کنڈی لگالی۔

انور یہ رنگ دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ منت کی، سماجت کی ڈرایا دھمکایا اور جب کچھ بس نہ چلا تو کہنے لگا "بیچنے وہ آگئیں"۔

"آگئیں دروازہ کھولئے"۔

شاہدہ ـ "ان کو دروازے تک آنے دیجئے"۔

انور ـ "آپ دروازہ تو کھولئے"۔

شاہدہ ـ "ان کو آنے تو دیجئے"۔

کوئی گھنٹہ بھر تک یہ بحث ہوتی رہی۔ جب انور بالکل ہی ناامید ہوا تو دبا کر دو گلاس اور پیئے اور کوٹھے پر چڑھ کر چھوٹی چھت پر آدھم سے نیچے۔ اب شاہدہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جس قدر منت پہلے انور نے کی اتنی بلکہ اس سے دگنی شاہدہ نے کی۔ مگر جس طرح وہ بے سود ہوگئی۔ اسی طرح یہ بیکار۔ انور شراب کے نشے میں چور تھا۔ آگے بڑھا۔ چلانا چاہتی تھی کہ ظالم نے سوتے بچے کو گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ روشنی دھڑا دھڑ ہو رہی تھی۔ دیکھتی ہے تو تیز چاقو انور کے ہاتھ میں موجود ہے۔ بچہ بے خبر پڑا سوتا تھا۔ اس ناگہانی مصیبت سے آنکھ کھل گئی تو ظالم کے پنجہ میں تڑپ رہا تھا!

انور ـ "اگر تیرے دل میں رحم نہیں ہے تو میں اپنی جان پر کھیلتا ہوں۔ مگر سب سے پہلے تیری آنکھوں کے سامنے تیرے کلیجے کے ٹکڑے کو بکری کی طرح ذبح کر دوں گا۔ یہ صحن اس معصوم کے خون سے اور تیرے کپڑے اس سے لال ہوتے ہیں"۔

بچہ نے حسرت بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ گرفت نشہ کی تھی۔ غصہ کی تھی۔
سخت تھی۔ معصوم آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ بے بس تھا، مجبور تھا،
لاچار تھا۔ نیم تربیت یافتہ ماں کے سوا صرف نیم کی پتیاں اور آسمان کے تارے اس وحشت
ناک منظر کو دیکھ رہے تھے۔ عجیب وقت اور نازک حالت تھی۔ جانتی تھی کہ غنچہ بے بہا
پھول اس جفاکار کے ہاتھوں پامال ہوگا۔ ممتا کی ماری بلبلاتی تھی۔ گڑگڑاتی تھی۔ تڑپتی
تھی، روتی تھی، یہاں تک کہ چاقو کی دھار معصوم کلیجہ کے پاس پہنچی اور اس تڑپ نے بدنصیب
ماں کو فریبی برادر کے قدموں میں گرا دیا۔ روئی، اور رو کر کہا "مجھ پر رحم کر۔ یہ نہیں بچوں میں ایک
بچا ہے۔ وہ گنوا کر یہ صورت اتنی دیکھی ہے۔ میں وہ بدنصیب ہوں جو اپنے ہاتھوں وہ نقد کھو
بیٹھی ہوں جو اپنی عقل سے اس آنکھوں کے تارے کو پھولوں کی سیج سے اٹھا کر اس مقتل
میں لائی۔ اور اپنی نادانی کی بدولت اس بیگناہ ہستی کو تیرے قبضہ میں دیدیا۔ دیکھ! ظالم
اس بچہ کو دیکھ! یہ ڈر رہا ہے۔ چھوڑ دے للہ میرے بچے کی گردن آزاد کر دے۔ یہ
بیگناہ معصوم دہل رہا ہے۔ اس کا دم نکل جائیگا۔ اس کا گلا گھٹ رہا ہے۔ اسکی جان فنا ہو جائیگی"

انور۔ "مگر میری حالت اس سے بدتر ہے۔ تڑپ رہا ہوں، مر رہا ہوں۔ تیرے
قدموں میں سر ہے۔ تیرے ہاتھوں میں زندگی ہے۔ رحم کر میں اس سے بہت زیادہ
رحم کا مستحق ہوں"۔

شاہدہ۔ "چھوڑ دے۔ او دغا باز چھوڑ دے۔ او مکار چھوڑ دے۔ دیکھ اسکی
آنکھیں نکل پڑیں"۔

انور۔ "کبھی نہیں، ہرگز نہیں تو کٹر ہے، تو پتھر ہے۔ تو اس سے زیادہ سزا کی
مستوجب ہے۔ دیکھ کیا ہوتا ہے اور کیا ہوگا اگر یہ واقعی تیرا بچہ ہے، اور تو اس کو بچانا
چاہتی ہے۔ تو یہ گھر اور اس گھر کا مالک دونوں تیرے غلام ہیں۔ تو یہاں رہ۔ آرام کر۔
حکومت کر، خوش رہ، اور خوش رہنے دے"۔

شاہدہ۔ "تو اس بدنصیب پر اور اس بیوقوف پر جو محض اپنے نتیجے میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی رحم کر اس بچہ پر جس کا باپ موجود۔ اس عورت پر جس کا شوہر زندہ اس پر جو شریف کا بچہ اس پر جو رئیس کی بیوی ہے۔ رحم اور اپنی شرافت سے مجھ کو وہ وقت نہ دکھا کہ میں دُنیا سے نامراد رخصت ہو جاؤں۔ میں اب بھی اگر ایمان کوئی چیز ہے تو عزیزوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میرا کلیجہ نکل رہا ہے۔ میرا سر تیرے قدموں میں ہے اپنے قصد سے باز آ اور اس بچہ کو چھوڑ دے"۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ خلق خدا نیند کے مزے لے رہی تھی۔ مغرب کی اندھا دھند تقلید کرنے والی نیم یافتہ لڑکی کی آواز ہوا میں گونجی۔ اس کے پاس اس کے سوا کیا تھا کہ پڑوسیوں کی مدد لے۔ چیخنا شروع کیا۔ لوگ دوڑ پڑے، دروازہ بند تھا توڑا اندر گھسے، دیکھا انور رانشر میں چور، عورت حیران، بچہ بے ہوش۔ حال پوچھا۔ افسوس کیا اور معاملہ پولیس کے سپرد ہوا اور انور کو سزا ہوئی۔

فیصلہ کا ایک حصہ جو جج نے لکھا یہ تھا:۔

"عورت کی داستان نہایت دردانگیز ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی کی دُھن اور تعلیم کے شوق نے اس کو یہ دن دکھایا مگر ایسا کہنا تعلیم پر زبردست حملہ ہوگا۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا حکم صاف ہے اور ان کے ہاں ایسی ایسی عورتیں گذری ہیں جن کے سامنے جید سے جید عالموں کی گردنیں ہمیشہ جھکیں۔ مسلمان قوم ان مایۂ ناز خواتین کی ہستی سے بیر بز ہے جن کے نام بساطِ علم پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکے اور دمکے جب وقت نے ان کی حکومت کا پاسہ پلٹا اور حاکم سے محکوم، بادشاہ سے رعیت، اور امیر سے فقیر ہوگئے اس وقت ان کے پاس صرف ایک چیز رہ گئی۔ جو عورت کی عصمت تھی۔ اب ان کی تمام توجہ اس طرف

مبذول ہوئی۔ قانون ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور وہ سزائیں جو اسلام نے ان جرائم کے واسطے مقرر کی تھیں۔ ان کی دسترس سے باہر تھیں۔ اس لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پردے کو سخت کریں۔ اور اس طرح خواتین کو ایسے مواقع میسر نہ ہونے دیں جو اس قسم کے جرائم کے محرک ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح انہوں نے عورت کو اس آزادی سے کچھ نہ کچھ محروم کر دیا جو اسلام نے اس کو عطا کی تھی۔ مگر اس کا معاوضہ انہوں نے دوسری صورت میں کیا۔ اور اس کا اعزاز و احترام اور اعتبار سے بڑھا کر اس کی کمی کی تلافی کر دی۔ کچھ دوسری قوموں کے میل جول کا اثر تھا کچھ وقت کا مطالبہ۔ اب مسلمانوں میں ایک فریق ایسا پیدا ہوا جس نے اس تجویز کو غلطی پر محمول کیا اور سمجھا کہ ہماری عورتیں جاہل ہیں۔ ان کو پڑھا لکھا کر وہی حقوق دینے چاہئیں جو عطیہ اسلام ہیں۔ اس مقصد کے واسطے انجمنیں قائم ہیں۔ اور اخبار کام کر رہے ہیں۔ مگر اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول مذہب اس فریق کے پاس سے رخصت ہوا اور اس زبردست قربانی کے بعد بھی ان کو جو کچھ میسر آ چکا وہ صرف اتنا کہ اردو کی دو چار الٹی سیدھی سطریں لکھ سکیں۔ اسی کوشش کا نتیجہ یہ بدنصیب ماں شاہدہ بھی ہے"۔

پندرہواں باب

ایسی نا ہنجار لڑکی خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ سچ پوچھو تو کنبہ اور برادری کیا تمام دنیا میں ناک کٹ گئی۔ ایسا واقعہ میں نے تو کبھی عمر بھر سنا نہیں جو خود لڑکی اپنی آنکھ

سے دکھایا۔ میرا بس چلتا تو اس شناھر کا نامراد کو نصیر آباد ہی میں دفن کر دیتا۔ یہ تمام نتیجہ تمہاری غفلت کا ہے کہ تم اس سے ہمیشہ الگ رہیں اور ان کمبخت نرسوں مسوں نے اپنے رنگ پر ڈھال دیا"۔

بیوی۔ "اگر تمہاری یہ رائے ہے تو سچ ہو گی۔ میں اس کا کیا جواب دوں۔ جس روز سے سنا ہے جو کچھ دل پر گذر رہی ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہے۔ حرام موت نہ ہوتی تو میں تو کچھ کھا کر سو رہتی"۔

میاں۔ "غضب یہ ہے کہ اب بھی کمبخت کی آنکھ میں میل اور تیوری پر بل نہیں۔ وہی کلا، اور وہی زبان۔ اگر تعلیم کا انجام یہ ہے تو یقیناً تعلیم حرام"۔

بیوی۔ "تعلیم کا نتیجہ ہرگز یہ نہیں ہو سکتا۔ یوں کہو کہ طریقۂ تعلیم مستحسن نہیں۔ جس طرح تعلیم دینی چاہیئے اس طرح نہیں ملتی۔ اور جو ڈھنگ زہریلے ہیں انہیں سے کام لیا جا رہا ہے نتیجہ تو یہ ہونا ہی ہے"۔

میاں۔ "یہ تمہاری شاگردیں کمبخت اس قدر چلاتی ہیں کہ بات کرنی بھی تو مشکل ہے۔ ذرا ان کو خاموش کرو۔ کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس میں کیا مصلحت ہے کیا تم کو استانی گری کی روٹی کھانی ہے جو یہ اتنی ساری پال رکھی ہیں۔ پڑھانے لکھانے کا نتیجہ آنکھ سے دیکھ لیا، کان سے سن لیا اب تو یہ سلسلہ ختم کرو۔ تمہارے یہاں یہ خاندانی مرض ہے"۔

بیوی۔ "یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور اب تک تم معاملہ کی تہ کو نہ پہنچے۔ اس تعلیم کا نتیجہ خراب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کا عین منشا اور ہماری ضرورتوں کے قطعی مطابق ہے۔ لڑکیوں کو میں ابھی خاموش کر دیتی ہوں۔ مگر اس طریقہ کو قابل اعتراض سمجھنا غلطی ہے۔ مبارک ہے وہ گھر جہاں خدا کے مقدس الفاظ کانوں میں آئیں اور عاجز بندے اس کی بردست طاقت کے سامنے عجز کی زبان کھولیں۔ یہ تعلیم ان کی دنیا اور دین دونوں

کی فلاح کا باعث ہے - خرابی آن کر یہ پڑی ہے کہ تمہارا وہ فریق جو تعلیم جدید کا دلدادہ ہے اصلیت پر غور نہیں کرتا - تم جس بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو چاہو لاکر ان سے مقابلہ کرلو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تعلیم نسواں جائز بلکہ ضروری اشد ضروری مگر طریقہ تعلیم یہ مستحسن الا وہ مکروہ"۔

بیوی کی گفتگو ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک لڑکی سامنے آئی اور کہا کہ "ظہر کی اذان ہو رہی ہے"۔

بیوی - "تم نے دیکھا اس کی عمر مشکل سے سات برس کی ہوگی مگر اس کے دل میں نماز کا شوق اس قدر کیونکر پیدا ہوا - اصل میں نماز کے بعد میں ان کے سامنے کہانی کے طور پر کچھ گذشتہ واقعات بڑی بوڑھیوں کے جو میں نے دیکھے اور سُنے بیان کیا کرتی ہوں - اس وقت تو یہ کہانیاں ان سے نماز پڑھواتی ہیں - مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عادت ان کی طبیعت میں رفتہ رفتہ اس قدر پکی ہو جائے گی کہ خواہ دنیا کی کوئی چیز بہتر سے بہتر ان سے چھوٹ جائے - مگر نماز نہ چھوٹے گی - اگر تم کو فرصت ہو تو آؤ آج اس چھوٹے سے مکتب کا بھی تماشا دیکھو"۔

لڑکیوں نے جھپا جھپ وضو کئے - قرآن شریف جزدان کر المار ی میں رکھے - تختیاں کونوں میں کھڑی کیں - اور کہا استانی صاحب بی بی نوبہار کا حال آگے فرمائیے"۔

استانی - "ہاں تو بیٹیو! خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے - جب ان کے میاں کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تو نوکری جاتی رہی - دن بھر گھر میں سر منہ اوندھائے اٹوانٹی کھٹوانٹی لئے پڑے رہتے - مرد کی عزت کمائی سے ہے - جب اس قابل نہ رہے تو وہ غصہ جھنجلاہٹ سب جاتا رہا - بچے سر پر چڑھتے اور بیچارے اُف نہ کرتے - یا وہ بندھا بندھی کہ ادھر اُنہوں نے گھر میں قدم رکھا اور اُدھر بیوی بال بچوں کے منہ سل گئے کس کی اتنی مجال تھی - کہ سانس بھی زور سے لے لیتا معلوم ہوتا تھا

نادر شاہ بیٹھے ہیں۔ یا اب یہ کیفیت ہوئی کہ لڑکے اور لڑکیاں سر پر ڈھنڈورہ
پیٹ رہی ہیں۔ اور وہ پڑے سن رہے ہیں۔ ساٹھ روپے مہینہ کے نوکر ہے اور
اُوپر کی بھی تھوڑی بہت آمدنی تھی۔ مگر ایسے فضول خرچ اور اتنے بے ڈھنگے کہ کبھی
وقت بے وقت کے واسطے کچھ رکھا ہی نہیں۔ ایک یہ مرض تو بارہ مہینے کا تھا کہ کبھی گھر
میں خالی ہاتھ نہ گئے۔ فصل کی ترکاری اور موسم کا میوہ رومال میں ضرور ہوتا تھا۔
رات کا دودھ کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ وہ بھی یہ نہیں کہ گھر میں، دس بجے رات کے چھ پیسے
رومال میں باندھ سیدھے حلوائی کی دوکان پر۔ دو چار یار دوست اور ہیں ادھر اُدھر
کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور سڑک پر کھڑے دودھ اُڑا رہے ہیں۔ پی چکے تو سب نے اپنا اپنا
کلھڑا پھینکا جس کی آواز زور کی ہوئی وہی اپنے فن کا اُستاد۔ مختصر یہ کہ اتنی پچاسی
روپیوں میں بیوی نو سر کے پلّے کوئی پچاس روپے پڑتے ہونگے۔ پانچ بچے دو میاں
بیوی ایک بڑھیا ماما آٹھ دم تھے۔ لاکھ سستا سماں اور کھلے دن تھے۔ مگر کپڑا لتا کھانا
پینا بیٹھے دم کے ہزار خرچ تھے۔ بیچاری جس طرح ہوتا لستم پستم گذر کرتیں ہاں موقعہ
جب ملتا۔ رنج دیکھتیں ہمیشہ کہتیں کہ خدا کیواسطے کچھ ساتھ ہے۔ دو لڑکیاں آ گئی
ہیں اس کھانے پینے کو کون دیکھتا ہے۔ کچھ تو آگے کی بھی سوچ کرو۔ مگر وہ اللہ کے
بندے تو ایسے کانوں میں روئی ٹھونس کر بیٹھے کہ کبھی دھیان ہی نہ کیا۔ نوکری گئی
تو کل تیرہ روز کی تنخواہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کے دن کی۔ اب پانی اترا تو آنکھیں کھل
گئیں۔ بیوی سے کچھ بولتے تو کس منہ سے، اور بچوں سے کہتے تو کس برتے پر۔ چھپکے چھپکے
رویا کرتے۔ ساری رات جاگتے اور اپنی غلطی پر پچھتاتے۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ بیوی (ان)
کے جبتک میاں نوکر رہا کرتے اکثر ان سے ناخوش رہیں اور ان کے ان ڈھنگوں کو کبھی اُنہوں نے
پسند نہ کیا۔ مگر میاں کا اندھا ہونا تھا کہ وہ پاؤں کی خاک ہو گئیں۔ کیا کوئی لونڈی یا ماما
خدمت کرے گی جو اُنہوں نے کی۔ بیوی کی یہ اطاعت دیکھکر میاں کا کلیجہ منہ کو آتا۔ صبح کی

نماز کا سلام پھیر، دعا پڑھنے بیٹھ جاتیں ادھر میاں نے آنکھ کھولی ادھر انہوں نے کُلی کو پانی دیا۔ اور دوائی پلاتی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اپنے ہاتھ سے دھوپ میں لیجا کر بٹھاتیں اور اپنے ہاتھ سے اندر لیکر آتیں۔ اس اطاعت نے میاں کے دل میں ایسا گھر کیا کہ وہ ان کے پاؤں چومتے اور کہتے کہ جنت کی حوریں بھی تم سے بہتر نہ ہوں گی ایک روز کا ذکر ہے تہجد کی نماز پڑھ کر اٹھیں کہ میاں نے کروٹ لی۔ کہنے لگیں:۔

"کیا جاگ رہے ہو کچھ کام ہے"؟

میاں۔ "کیا خاک جاگ رہا ہوں تقدیر کو رو رہا ہوں۔ تھوڑا سا پانی پلا دو"۔

بیوی۔ "کیوں رونے کی کیا بات ہے خدا کا شکر کرو کہ عزت آبرو سے گھر میں بیٹھے ہیں۔ لو پانی پیو"۔

میاں۔ "میری حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ تم سے کوئی کام لیتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ دن رات اسی فکر میں رہتا ہوں کہ کیا کروں۔ ایک پیسہ کی آمدنی نہ رہی۔ تماشہ ہے تم کو اس طرح گذارہ کرتی ہو"۔

بیوی۔ "تم کس قسم کی باتیں کیا کرتے ہو۔ تمہیں شرم کس بات کی؟ میں ہوں کس واسطے؟ جو کچھ کر رہی ہوں یہ میرا فرض ہے۔ روپے کی طرف سے تم زیادہ فکر نہ کرو۔ میں ہمیشہ یہ کیا کرتی تھی کہ جو روپیہ تم میرے ہاتھ میں دیتے تھے فی روپیہ ایک آنہ الگ کر دیتی تھی۔ ایک پیسہ اللہ کے نام اور تین پیسے تھوڑا۔ جب وہ پیسے روپیہ ہو جاتے تو پیسے دیکر روپیہ منگوا لیتی تھی اور ڈال دیتی تھی۔ اب جو میں نے دیکھا تو خدا نے یہ برکت دی کہ سات سو روپے ہو گئے۔ بمبئی والے سیٹھ کی بیوی پرسوں کہہ رہی تھیں کہ تم وہ روپیہ دیدو میں بنچ میں ڈلوا دیتی ہوں میں روپے مہینے کے مہینے لے جانا اب اگر تمہاری اجازت ہو تو دیدوں، نہیں تو یہ روپے حاضر ہیں جو تمہاری صلاح ہو وہ کروں"۔

میاں۔ "میرا تو منہ نہیں جو تمہاری تعریف کروں خدا تم جیسی بیویاں دنیا کو دے

بمبئی والا سیٹھ نہایت ایمان دار آدمی ہے۔ تم فوراً روپیہ دیدو۔ بلا سے ہم کو تو پچیس روپے بیس اشرفیاں ہو جائیں"۔

پیاری پھوپھی! یہ بیوی نواب کا سلیقہ تھا کہ اسی بیس روپے میں انہوں نے گھر کا خرچ بھی چلایا۔ ایک بیٹی تھی بیاہی اور دنیا کے سب کام کاج کئے۔ لاکھ روپے کی بات جو انہوں نے کی وہ یہ تھی کہ اس مفلسی میں گھر کی ہوا نہ بگڑنے دی"۔

سولھواں باب

کچھ وقت کا مطالبہ تھا کچھ پہاڑ کی آب وہوا کا اثر زاہدہ کا شوہر چراغ پا تو ہو ہی چلا تھا۔ اب صحبت بھی ان لوگوں کی ملی جو دن رات فیشن کا کلمہ پڑھتے رہتے تھے۔ آمدنی معقول تھی۔ آنکھیں کچھ اور ڈھونڈنے لگیں۔ گھر، گھر کی حالت۔ دری۔ چاندنی، برتن بھانڈا سب چیزیں زہر معلوم ہوتی تھیں حد یہ ہے کہ گھر کے ساتھ گھر والی بھی آنکھوں کو ناگوار ہوئی اور جی چاہا کہ گھر بدلے اور ساتھ ہی گھر والی کی بھی تبدیلی ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو تعلیم یافتہ بیویاں میسر آتی ہیں۔ اور جو جانتی ہیں کہ زندگی کس طرح بسر کریں۔ ان کی ہر ادا، ان کی ہر کوشش، ان کا ہر فعل، ان کا ہر قول طبیعت کو خوش اور دل کو چونچال دماغ کو تازہ اور شوہر کو باغ باغ کر دیتا ہے۔ کاش میری تقدیر میں ایسی بیوی ہوتی۔ اور میں بھی دنیا کا کوئی لطف اٹھا سکتا۔ آخر اسی بیوی کی بہن شاہدہ ہے میں نے صرف چوتھی والے روز دیکھا تھا۔ صورت شکل نہایت چست، کپڑا لتا، گہنا پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ علم کی خوشبو اس کے ہر ذرہ سے مہک رہی تھی۔ کیا خوش نصیب ہے اس کا شوہر جس کو ایسی بیوی ملی۔ ایک یہ ہیں ہیولے کہ سوا دنیا کو سی خیالات اور جہالت کی گفتگو کے کوئی آواز ہی کان میں نہیں آتی۔ مگر مجھے فکر کس بات کا۔ روٹی کپڑا دئے جاؤنگا اور میں دوسرا نکاح کرونگا۔ کیا وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہو کر ایک جاہل عورت کے ساتھ اپنی زندگی برباد کروں۔

مجھ کو خدا کی اجازت خدا کے رسولؐ کی اجازت اشد ضرورت پھر نہ کرنے کا سبب؟

لڑکیوں کی کیا کمی احسان کے اس خیال کا زبان تک آنا تھا کہ خود ہی لڑکیوں کے ورثا بھی ہو گئے۔ اب یہ میاں کی عنایت سمجھو، انسانیت کہو، انصاف سے تعبیر کرو، جو چاہے کہو کہ اُنہوں نے بیوی کو بھی اطلاع دیدی اور اس طرح کہا:۔

"تم کو معلوم ہے کہ شرعِ اسلام نے مرد کو چار نکاحوں کی اجازت دی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میری زندگی بالکل برباد ہو رہی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس طرح یہ زندگی غارت ہو۔ مجبوراً میں نے کوشش کی ہے کہ ایک تعلیم یافتہ عورت سے عقد کر دوں۔ اور اس طرح کمی کو پورا کر لوں۔ مگر میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے شرعی حقوق نہ بھولوں گا"۔

زاہدہ۔ "بیشک تم کو شرع نے اجازت دی ہے۔ اور مجھ کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں۔ مگر میں اپنی محبت سے مجبور ہوں۔ اس کو آسانی سے برداشت نہ کر سکوں گی۔ تم شوق سے نکاح کر لو۔ مگر میری رائے میں یہ مناسب ہو گا کہ تم مجھ کو چند روز کے واسطے گھر پہنچا دو"۔

احسان۔ "نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ سب باتیں گوارا ہو جائیں گی یہ خاطر جمع رکھو کہ تمہارے اعزاز و اکرام میں کسی قسم کا فرق نہ آئے گا"۔

زاہدہ۔ "یہ تو مجھے تمہاری عنایت سے اُمید ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم پردیس میں میری بے وقعتی نہ ہونے دو گے لیکن اسوقت تو اگر تم مجھ کو پہنچا دو تو اچھا ہے"۔

احسان۔ "بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں اس کو پسند نہیں کرتا"۔

زاہدہ۔ "اگر تمہاری رائے میں میرا یہاں کا قیام ضروری ہے تو خیر"۔

احسان شادی کی دُھن میں مست تھا۔ اس کا دل تو یہ ہی چاہتا تھا کہ نئی بیوی کے سامنے پرانی کو دُور کر دے۔ مگر ایک جھجک تھی کہ عزیز اقارب سے سُنکر بگڑ نہ جائیں۔ اسوجہ

اس نے بیوی کا جانا مصلحت نہ سمجھا۔ اور یہی مناسب سمجھا کہ اس کو یہیں قید کرے شادی میں کیا ہاتھی گھوڑے لگتے تھے۔ جگہ تجویز ہوئی، تاریخ ٹھہری۔ نکاح ہوا، اور نئی دلہن گھر میں آ دھمکی۔

یوں تو اس واقعہ کا ہر ٹکڑا کھلا ہوا ظلم تھا۔ مگر وہ ظلم جس کی تلافی ناممکن تھی یہ ہوا کہ احسان نے بیوی کا تمام زیور نئی دلہن کو چڑھا دیا۔ اندیشہ تھا کہ شاید میاں کی یہ حرکت زاہدہ کو پسند نہ ہو۔ مگر نیک کوکھ کی بیٹی تھی انکار کیسا اور تامل کس کا ہنسی خوشی آگے رکھ دیا۔

نئی دلہن کی محبت اور دلہن بھی مغربی طرز کی تعلیم یافتہ جس کے میاں احسان جویا اور آنکھیں متلاشی۔ جس قدر بھی ہوتی کم تھی۔ قدموں کے نیچے آنکھیں بچھانا اسکی زبان سے کسی بات کے نکلنے کی دیر تھی تعمیل میں دیر نہ تھی۔ اب زاہدہ کی حیثیت صرف ایک ماما کی تھی۔ آٹھ آٹھ دن سر میں تیل ڈالنا گناہ تھا۔ البتہ نہانے کی عادت چونکہ بچپن کی تھی۔ اس لئے نہا تو روز لیتی تھی۔ نہا کر اٹھی اور وہی میلے کپڑے پہن لئے۔ احسان بیس روپیہ ماہوار بھی خرچ کرتا تو بھی زاہدہ جیسی ماما اس کو میسر نہ آتی۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا لڑکا نہ تھا، بچہ نہ تھا۔ اگر جھوٹ سوٹ بھی زاہدہ سے بات کرتا ہوں تو نئی دلہن سچ مچ مجھ سے بات نہ کرے گی۔ مہینہ مہینہ بھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ کھانا جو نئی دلہن نکال کر دیتی۔ اور کپڑا جو وہ اپنے ہاتھ سے بنا دیتی۔ سر آنکھوں پر رکھتی۔ چھ مہینے اسی طرح بسر ہوئے۔ اور اب سردی زور سے چمکنے لگی۔

صبح کے وقت ایک روز احسان اچھا بھلا تھا۔ ہاتھ منہ دھو مدرسہ گیا۔ مگر چار بجے کے بجائے ایک ہی بجے آ گیا۔ اور آیا اس طرح کہ بخار میں لوٹ تھا۔ شام کو خفیف سی سینہ میں کسک معلوم ہوئی۔

دوسرے روز ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے نمونیا تجویز کیا۔ صبح کو حالت خراب اور

شام کو بدتر اور چوتھے روز تو اتنی خراب تھی کہ بات تک ٹھیک نہ کر سکتا تھا۔ رات کو پھر ڈاکٹر آیا تو اُس نے کہا "طاعون کا بخار معلوم ہوتا ہے"۔ اب مغرب زدہ تعلیم یافتہ بی بی کا کیا کام تھا۔ مرضِ متعدی ہیں ٹھہر کر خود مرض میں کیوں گرفتار ہوتیں اسی وقت برقع اوڑھ سیدھی ہوئیں۔

زاھدہ بچاری جاہل بھوٹ، وہ مرضِ متعدی کو کیا سمجھتی۔ رات رات بھر میاں کی پائنتی نہ چھوڑی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ احسان بے خبر پڑا تھا۔ پچھلا پہر تھا۔ اور پردہ زمین کی خاموشی گھر کے کونے کونے سے ٹپک رہی تھی۔ تارے جھلملا جھلملا کر بے ثباتی دُنیا کے نعرے لگا رہے تھے۔ چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی کہ زاھدہ کے تخیّل نے اس کو ایک دوسری دُنیا میں پہنچا دیا۔ اس کو شوہر کی موت کا یقین ہو گیا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ دُنیا کی تمام خوشی زندگی کا مدار اس دم سے تھا۔ اس کی جھڑکی غیر کی عنایت سے اور اس کا غصّہ دوسرے کے پیار سے بہتر، جب یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ میری جنت ان قدموں میں اور میری دُنیا اس صورت میں پوشیدہ ہے۔ میں بدنصیب تھی کہ جسکی خوشی پر راحت اور مغفرت کا انحصار تھا۔ اس کو خوش نہ رکھ سکی۔ بعض دفعہ کیسی کیسی سخت باتیں اور کتنے کتنے ٹیڑھے جواب دیتی تھی۔ مگر خدا عمر دراز کرے۔ سُن کر چُپ ہو جاتے تھے۔ اب یہ کہاں اور میں کہاں۔ میری زندگی برباد اور میری عاقبت ناراج ہوئی۔ میں نے کیا غضب کیا کہ قصور بھی تو معاف نہ کروا لیا۔ اب دو گھنٹے سے بات بھی نہیں کی۔ دوا کیونکر پلاؤں۔ تین بج چکے۔ آنکھیں ہی نہیں کھولی۔ ہائے یہ سانس کیسا چل رہا ہے۔

زاھدہ گھبرا کر اُٹھی آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں جاری تھیں۔ مُنہ دیکھا اور بیساختہ یہ کہہ کر پاؤں پہ گر پڑی:۔

"مجھ لونڈی کا قصور معاف کرو"

آنکھیں تلوؤں سے مَل رہی تھی۔ احسان کی آنکھ کھلی۔ بیوی کی محبت برچھی کی طرح کلیجہ میں گھُسی اور ساتھ ہی نئی دُلہن کے چلے جانے کے خیال نے تمام حوصلے پست کر دیئے۔ زاھدہ کا اضطراب بجلی بن کر کلیجہ پر گرا۔ اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور کہا:۔

" مجھ سے غلطی ہوئی۔ اگر زندہ رہا تو عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیوں گا"۔

ابھی احسان کا شکریہ ختم نہ ہوا تھا کہ مؤذن کی صدائے توحید نے رات کی خاموشی کا سلسلہ توڑا۔ اُٹھی وضو کیا۔ نماز پڑھی اور شوہر کی صحت کیوا سطے گڑگڑا کر خدائے واحد کے حضور میں روئی۔ وقت نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ نمازن کی دُعا قبول ہوئی۔ مختصر یہ کہ دوا نے اثر کیا اور احسان کی حالت روز بروز سنبھلنے لگی۔

لُوٹا باسن کسیرے کے سر جب تک احسان بیمار رہا زاھدہ کی ملکیت تھا۔ مگر تندرست ہوتا تھا کہ نئی دُلہن معہ اپنے تمام حقوق کے گھر میں آ اتریں۔ زبردست کے بسوے بیس زاھدہ پھر وہی ماما تھی۔ اور نئی دُلہن گھر والی۔ احسان اگر ذرّہ بھر عقل سے کام لیتا اور غور کرتا تو واقعات آنکھ کے روبرو تھے۔ مگر بدبخت ٹھوکر کھا کر بھی نہ سنبھلا۔ اب نئی دلہن کو زاھدہ کی زندگی ایک کانٹا تھا۔ جو ہر وقت دل میں کھٹک رہا تھا۔ لاکھ وہ دَب چکی تھی اور اگر گھر سے اب اس کو واسطہ تھا تو صرف چولھے سے۔ مگر چاتر کی دُور بلا۔ ہر وقت اور ہر موقعہ پر نئی نویلی ایک نہ ایک بات ایسی جَڑ دیتی کہ احسان آگ بگولا ہوجاتا۔ اور منہ میں جو آتا سُنا جاتا۔

ایک روز شام کے وقت احسان نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ زاھدہ نے ہنسی ہنسی اور خوشی خوشی کھانا تیار کر دُلہن کے آگے لاکر رکھ دیا اور کونہ میں بیٹھ گئی۔

دُلہن:۔ " بس باورچی خانہ میں جاؤ میرے سر پر کیوں چڑھ کر بیٹھ گئیں"۔

زاھدہ:۔ " ہاں بیوی چلی جاتی ہوں۔ اس لئے بیٹھ گئی تھی کہ شاید برتن وغیرہ کی ضرورت ہو تو دیدوں"۔

دُلہن۔ "نہیں جب وقت ضرورت ہوگی میں خود بلا لوں گی"۔

یوں تو دن رات ہی زاہدہ کے دل پر ایک سے ایک زبردست چرکا لگتا تھا۔ مگر اس وقت کا کچوکا ایسا بیٹھا کہ آنکھ میں آنسو آ گئے۔ دس بارہ آدمیوں کا کھانا ایک اکیلی پکانے والی۔ دو بجے کی چولھے پر گھسی گھسی مغرب کے وقت نکلی۔ اور یہ انعام ملا۔ علیحدہ جا کر رونے لگی کہ احسان آیا اور کہا "کھانا باہر کون دے گا؟"

دُلہن۔ "لاؤ میں یہاں سے دیدوں گی تم وہاں سے لے لینا"۔

احسان۔ "واہ تم کیوں دینے لگیں۔ زاہدہ کہاں ہے؟ بتاؤ۔ جواب نہیں دیتیں"۔

دُلہن۔ "کیا بتاؤں وہ ہمیشہ ناخوش رہتی ہیں۔ میرا جو کام تھا۔ میں نے کر لیا۔ کیا حرج ہے میں ادھر سے دیدوں گی تم اُدھر سے لیلو"۔

احسان۔ "زاہدہ! زاہدہ!!"

زاہدہ۔ "جی"۔

احسان۔ "کیا مصیبت ڈھا رکھی ہے ہر وقت گدھے پر سوار"۔

زاہدہ نے احسان سے چھپانے کے واسطے دوپٹے سے آنسو منہ پھیر کر پونچھے اور کہا "آپ جو فرمائیں حاضر ہوں"۔

احسان۔ "کھانا اِدھر سے کھڑے ہو کر دیدو"۔

زاہدہ۔ "اچھا"۔

نئی دُلہن نے کھانا نکالا۔ زاہدہ نے اُٹھا اُٹھا کر باہر دیا۔ مگر نہ معلوم کیا زہر کھانے میں تھا کہ ایک ایک نوالہ کھا کر سب نے ہاتھ سکیڑ لیا۔ چاولوں میں نمک زہر، سالن میں مرچیں ہلاہل۔ اور تو اور غضب یہ کہ فیرنی میں برابر کی خاک اور کھانوں میں برابر کی راکھ۔ احسان کے ہوش جاتے رہے۔ دعوت عداوت اور ضیافت مصیبت ہو گئی۔

بازار سے جو کچھ میسّر ہوا لا لوان کے پیٹ بھر چلتا کیا۔ اور آپ آگ بگولا گھر میں آ ساری داستان دُلہن کو سُنائی۔

دُلہن۔ "میں تو اسی واسطے سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں کہ اپنا کام مہا کام۔ ہاں ان گجراتی کنگنوں میں یہ مار ہے کہ مرچیں اندر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس لئے مصالحہ ان سے پسوا لیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ یہ آفت ڈھائے گی۔ ورنہ میں تو ان کو باورچی خانہ میں قدم بھی نہ دھرنے دیتی"۔

احسان۔ "یہ تو صورت دیکھ دیکھ کر جلی جاتی ہے۔ شریف تھوڑی ہے جو شرافت کے برتاؤ کو سمجھے۔ میں اس کمبخت کو غارت کر دیتا ہوں۔ اور اس کے منہ ہی کو آگ لگاتا ہوں"۔

بدنصیب بیوی کی کیا مجال تھی کہ سفّاک شوہر کے حکم میں دم مارسکتی۔ جبتک جاگتا رہا صلواتیں سُناتا رہا۔ کنبہ بھر کو اُگلتا۔ سات پشتوں کو پُنتا۔ جو جی میں آئی وہ سُنائی۔ اور جو مُنہ میں آیا وہ بنایا۔ صبح اُٹھا تو حکم دیا کہ "آج تو غارت ہو گی اپنا اسباب وسباب باندھ لے"۔

زاهدہ آہوں کا پورا ذخیرہ شوہر کے پاس چھوڑ حسرتوں کا وزنی اسباب ساتھ لے پہاڑ سے چلی۔ گھر کو گھر کے کونہ کونہ کو آخری نظر سے دیکھا۔ محلہ اور محلہ کا بچہ بچہ اس کو دُعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہا تھا۔ رانڈیں اس کی بلائیں لیتی تھیں۔ اور یتیم اس کے قدموں میں لوٹتے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے وقت ایک التجا بھری نظر شوہر کی صورت پر ڈالی۔ اور کہا:۔

"خدا کے واسطے میرے قصور معاف کر دینا"

اگر ایمان پاس ہوتا، اگر عقل ساتھ دیتی تو مظلوم بیوی کی یہ التجا ظالم کا کلیجہ توڑ دیتی۔ مگر دل سے نہیں دکھاوے کو نہیں۔ فقط شوق پورا کرنے کو ہاتھ بڑھا کر

مصافحہ کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بدنصیب بخار میں بُھلس رہی ہے۔ پوچھا کیا حال ہے؟

زاہدہ۔ "خدا کا شکر ہے"۔

احسان۔ "رونے کا سبب؟"

زاہدہ۔ "کچھ نہیں۔ ایک بات عرض کرنی ہوں"۔

احسان۔ "کیا ہے؟"

زاہدہ۔ "تمہاری تنخواہوں میں سے کچھ روپے میرے پاس بچے ہیں یہ لے لو خدا نصیب کرے"۔

دو سَو روپے کی ایک پوٹلی زاہدہ نے شوہر کے ہاتھ میں دی اور روکر کہا:۔

"میری خطائیں معاف کر دینا"۔

احسان۔ "اچّھا"۔

زاہدہ۔ "خدا حافظ"۔

زاہدہ کی گاڑی مشکل سے سو گز گئی ہوگی کہ احسان ہانپتا کانپتا دوڑا آیا اور دُور سے گاڑی بان کو آواز دی کہ روکو۔ گاڑی رک گئی۔ احسان کا چہرہ غصّہ سے سُرخ تھا۔ وہ بُرا بھلا کہتا ہوا اندر گُھسا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا:۔

"کمبخت چور! روپیہ دیکر شاہ بنی۔ اور سارا زیور اُڑا لائی"۔

احسان کا غصّہ اس قدر تیز تھا اور اس قدر چلّا رہا تھا کہ اسکی حالت دیکھ کر لوگ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ اسباب نکال نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا۔ اور زبان سے وہ الفاظ استعمال کیئے جن کو سُنکر خلقت بھی دنگ رہ گئی۔ زاہدہ بخار میں لوتھ مبارک کی صورت تک رہی تھی کہ احسان نے کہا "بتا کمبخت نامراد زیور کہاں چُرا کر رکھا؟"

زاہدہ۔ "مجھے معلوم نہیں میں تو دلہن کے کمرے میں گُھسی بھی نہیں"۔

احسان۔ "پکّی چور ہے کیوں نہ لینے لگی ماں اس بکس کی کُنجیاں دے"۔

بخار کا زور، چوری کا الزام، خلقت کا اژدھام۔ بدنصیب کے منہ سے بات نکلتی تھی۔ وقت کی بات ہے کنجیاں نہ ملیں۔ احسان کو تاب کہاں تھی۔ اتنا کہہ کر کہ "ہاں چوری کھلتی ہے کنجیاں تو آپ ہی سے کھوئی جائیں گی۔" پتھر سے قفل توڑا زیور کی پوٹلی موجود تھی۔ نکالکر اس زور سے منہ پر ماری کہ چکرا گئی۔ گاڑی کو لوٹا کر گھر لے گیا۔ نئی دلہن دروازہ میں کھڑی تھیں دیکھتے ہی گھبرا کر پوچھا "کیوں ملا؟"

احسان۔ "ہاں کیوں نہ ملتا"۔

اسباب اترا زاہدہ اندر آئی۔ چوری کے غل غپاڑے سے محلہ کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ زاہدہ خاموش گم سم کھڑی تھی۔ اور کہتی تھی "زمین شق ہو جائے اور میں سما جاؤں" کہ دلہن نے کہا :۔

"خدا کا شکر ہے میں نے ابھی دیکھ لیا۔ ورنہ وہ تو میرے اوپر تھوپ ہی چلی تھیں"۔

احسان ۔ "اری بول تو سہی جل جوگنی! چور! آنکھوں کا کاجل چرانے والی بھی تجھ سے زیادہ نہ ہو گی کمبخت !"

محلہ والیاں بھی جو منہ میں آتا کہتی رہیں۔ اور کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو زاہدہ پر لعن طعن نہ کر رہا ہو۔ ایک خاموش تصویر تھی، ایک ساکت پتھر تھا، ایک گم سم عورت تھی جس کی آنکھ سے متواتر آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھتی نہ تھی۔ بات ہوتی نہ تھی۔ انتہائے ندامت تھی کہ دن رات دعائیں دینے والیاں "پکا چور" کہہ رہی تھیں۔ دلہن بولی "یہ تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ خدا معلوم کس وقت نکال کر رکھا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ تم نے روپے مانگے۔ میں صندوق کھولنے گئی۔ دیکھتی ہوں تو پوٹلی ندارد۔ غضب خدا کا گھر میں یہ آفت، کہو وہ کس کا تھا۔ کمائی تو ایک ہی کی ہے۔ تمہارا مال کس کا اور میرا کس کا"؟

نئی دُلہن کوشش میں تو عرصہ سے تھی کہ کسی طرح ایسا ذلیل اور ایسا رسوا کروں کہ احسان اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا کیسا اس کا نام تک نہ لے۔ مگر موقعہ کا انتظار تھا۔ اب جو زاھدہ نے اسباب باندھنا شروع کیا تو چپکے سے بکس میں زیور رکھ۔ خاموش آ بیٹھی۔ اور جب گاڑی روانہ ہوگئی تو میاں سے کہا کہ "زیور لے گئیں" چوری پوری اور مال سامنے تھا۔ اسوقت تک احسان کی بدولت جس قدر مصیبتیں آئیں زاھدہ نے ان کو راحت سمجھا۔ سوکن کے کانٹے پھول کی طرح گود میں لئے اور ناگ سے کھلونے کی طرح کھیلی۔ مگر اس صدمہ نے جان پر بنا دی۔ عورتیں صحن میں کھچا کھچ بھری تھیں۔ نئی دُلہن نے ستم یہ کیا کہ اسی وقت اپنے رشتہ داروں کو بھی تماشا دیکھنے کے لئے بلا لیا۔ ہر طرف سے لعنت، اور ہر کونہ سے ملامت کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ شام کے وقت احسان نے برابر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے زاھدہ کو بھیجنے کی تجویز کی اور کہا "تجھ چور مکار کی سزا تو یہ تھی کہ عمر بھر جیل خانہ میں سڑ سڑ کر مرتی مگر ہم شریف ہیں کہ اپنی شرافت سے کام لے کر تجھ پر رحم کرتے ہیں"۔

اب البتہ ایک جوش زاھدہ کے سینہ میں اُٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اس کی آواز غصّہ سے بھرّا گئی۔ اس نے سوکن کی طرف دیکھا اور کہا "انسانی آنکھ سے پوشیدہ رہنے والا ہر معاملہ قُدرت کی اس زبردست آنکھ کے سامنے ہے جو پہاڑ کی دراڑ میں چیونٹی کے رینگنے کی اور کھو کھلے تنے میں کیڑے کی حرکت کو دیکھتی ہے۔ شہادت صرف چشم ظاہری پر ختم نہیں۔ جن مظلوموں کا کوئی نہیں ان کی بے گناہی کا گواہ صرف وہ قُدرت والا ہے۔ جو اس فانی جسم کو ایک روز خاک کردے گا اور جانتا ہے کس نے زیور کی پوٹلی اس بکس میں رکھی۔ میں نے اگر اس پردیس میں اپنے خاندان کی آبرو اور اپنے باپ دادا کی لاج پر چوری کا الزام لگا کر نہ دل کو بدنام کیا اور مردوں کو اذیت دی تو اس کا بہتر فیصلہ کرنے والا وہی احکم الحاکمین ہے۔ دنیا کی کسی حالت کو ثبات و زندگی کی

کسی کیفیت کو قیام نہیں۔ اطمینان عارضی اور خوشی چند روزہ مہمان ہے جس طرح موت زندگی کی تاک لگائے بیٹھی ہے۔ اسی طرح بے اطمینانی اطمینان کے شکار میں مصروف ہے" دلہن بیگم جس وقت نے مجھ سے وفا نہ کی، تم سے بھی نہ کریگا۔ یہ انسانی ہستی جو شوہر کی حیثیت میں میرے سامنے کھڑی ہے۔ اسکی بدولت میں بھی اس دنیا میں راج کئے۔ مگر آج جب میرا تخت چھن گیا۔ اور میں سلطنت کھو کر تمہاری دست نگر ہوں تو صرف یہ خیال مجھے تقویت دے رہا ہے کہ سہاگ کے زعم میں نااتفاقی کی آگ کو فراموش نہ کیا۔ کوئی بات ایسی نہ کہی اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو دوسروں کے واسطے کلفت اور اذیت ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ اگر آج تک کوئی برائی کی ہو، کوئی ایذا پہنچائی ہو تو تم مجھے بتا دو۔ میں نے کڑوے گھونٹ شہد کی طرح پیئے اور زہر کا پیالہ امرت سمجھا۔ اس سزا کی سزاوار نہ تھی کہ میری عزت اس بھرے مجمع میں اس طرح برباد ہو۔ اور میری چوری کا غلط ڈھنڈورہ پردیس کی سڑکوں پر پٹے۔ خیر خدا کی مرضی اور شوہر کی رائے سر آنکھوں پر۔ جو ہو گیا خوب ہوا، اور جو ہو گا اچھا ہو گا۔ لیکن وقت آئیگا کہ شاید حقیقی کی صدا واقعات سے تاریکی کا پردہ اٹھا دے گی۔ اور دنیا دیکھے گی کہ زاہدہ بے گناہ تھی"۔

ہچکی بندھی ہوئی تھی، اور وہی در و دیوار جو لعنت برسا رہے تھے زاہدہ کی صداقت کا نعرہ لگانے لگے۔ احسان خاموش اور دلہن ششدر تھی کہ زاہدہ آگے بڑھی اور شوہر سے کہا "چلو جس جگہ پہنچانا ہے پہنچا دو۔ مؤذن اذان دے رہا ہے نماز قضا نہ ہو"۔

ایک ایسی رفتار سے جس میں سرتاپا ندامت شامل تھی احسان چلا۔ اور زاہدہ کو دوسرے گھر میں لے جا کر بٹھا دیا۔

سترہواں باب

"وقت نے تم کو اتنا بڑا جھکولا دیا اور وہ مصیبت ڈالی کہ اگر پتھر بھی ہوتا تو موم بنکر خدا

کے حضور میں گر پڑتا۔ اور مان لیتا کہ قدامت کے کیسے کیسے جوہر تم نے خاک میں ملا دیے!

جن کو تم جاہل اور پھوہڑ کہہ رہی ہو وہ درحقیقت ایسی تھیں کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھتے۔ مگر افسوس تمہاری عقل پر! اور تعجب تمہارے قیاس پر کہ اپنی آبرو گنوا کر بھی تمہاری عقل درست نہ ہوئی"۔

شاہدہ ۔ "آپ ہر وقت مجھ کو اسی ایک بات کا طعنہ نہ دیا کیجیے۔ اس کو اس کیا واسطہ میں جو بات کہہ رہی ہوں اس کا جواب دیجیے۔ یہ جو آئے دن کمبخت فقیر ہٹے کٹے موٹے تازے گُل کھلاتے رہتے ہیں کہیں کوئی صوفی بن کر زیور لے اُڑے، کہیں کوئی جن بن کر گھر موس لے گئیں، یہ سب قدامت کے کرشمے نہیں تو کیا ہیں؟ آپ ہی کا بیان ہے، بارہا آپ نے کہا آپ کی والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ آپ کی چچی جان کو ایک بڑھیا نے بیرانی بن کر ایسا دبوچا، اور اتنا صفایا کیا کہ دانت کریدنے کا تنکا تک نہ رہا۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں، ان بدمعاشوں کے واقعات ان کے کانوں سے نکل چکے ہوتے، ان کٹنیوں کی چالاکیاں وہ اخباروں اور کتابوں میں پڑھ چکی ہوتیں، تو کیوں اس کے چکمہ میں آتیں؟ شوہر کے گاڑھے پسینے کی کمائی، بچوں کا محنت سے پیدا ہوا پیسہ، اس طرح برباد نہ ہوتا۔ اماں جان آپ نے ان کی حالت پر تو ہمیشہ افسوس کیا مگر یہ بھی خیال فرمایا کہ آپ کے چچا جان پر کیا گذری ہوگی۔ جن کی جمع جتھا ایک جاہل عورت کی بدولت کٹنی کی نذر ہو گئی"۔

ماں ۔ "تم ایک بات کو دوسری بات میں نہ ملایا کرو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے اقرار کیا ہے کہ اگلی بیویاں باوجود ان تمام خوبیوں کے جو ان کا حصّہ تھیں۔ اس قدر بھولی ہوتی تھیں کہ کسی کو جھوٹا سمجھنے کا وہم بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا اور اگر تم غور کرو تو ان کی یہ تربیت کچھ غلط نہ تھی۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی مسلمان کی طرف سے

بدظن نہ ہو۔ اب اس کا ذمہ دار وقت ہے کہ کیوں ہم میں ایسے مسلمان پیدا ہونے شروع ہوتے جو اسلام سے ہزاروں کوس دور رہے۔ اور روحانیت کو کھو کر نفسانیت میں غرق ہو گئے۔ تمہاری تعلیم کھرے اور کھوٹے کی تمیز بتاتی ہے۔ اور میں اس کو ضروری سمجھتی ہوں لیکن ان کے یہاں کھوٹ کا وجود ہی نہ تھا اس لئے ان کو اس شناخت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اب البتہ اس تعلیم کی ضرورت ہے اور اگر برا نہ مانو تو اس کی ذمہ دار بھی ترقی ہے۔ اگر زمانہ اس قسم کی ترقی نہ کرتا تو ہم بھی وہی سیدھے مسلمان ہوتے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ گنڈے تعویذوں کی طرف ان کا عقیدہ پختہ تھا اور گو میں خود ان ڈھکوسلے باز پیروں کی قایل نہیں ہوں۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ دعا کے اثر کی میں قایل ہوں۔ اور اس کا فیصلہ تم خود اس طرح کرو کہ اگر تم کو کوئی معمولی بات تمہارے مزاج کے خلاف کہدیتا ہے تو آگ لگ جاتی ہے۔ اور اگر کوئی عاجزی سے گڑگڑا کر کچھ عرض کرے تو خواہ مخواہ طبیعت میں رحم پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح بندہ جب خدا کے حضور میں سچے دل سے رو کر کچھ مانگتا ہے۔ تو وہ سنتا ہے اور ضرور سنتا ہے۔ اسی سلسلے میں ان بزرگان دین کی دعا شامل ہے۔ جو خدا کے پاک بندے سچے مسلمان اور نیک انسان ہیں یہ وجہ ہے کہ بچی جان گنڈے تعویذوں کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ ایسا بھی اگر کوئی ولی کامل نظر آجائے جس کا نظر آنا محال، تو سب سے پہلی عورت جو ان کے ہاتھ پر بیعت کرے میں ہوں۔ لیکن یہ موجودہ گنڈے اور تعویذوں کی غرض صرف دھوکا ہے۔ حقارت سے رد کرنیوالی بھی میں ہی ہوں۔ تم نے ان کی اس غلطی کو تو پکڑ لیا۔ جو غلطی نہیں بلکہ تلاش حق تھی۔ اور ان کی نیت یقیناً قابل الزام نہیں مگر ان کی بھلائیوں پر کبھی تو کبھی نظر ڈالی ہوتی۔ وہ وہ کرگئیں کہ آج تم اور میں ہرگز نہیں وہ جیسے ہو پیدا نہ کرسکیں گی۔ دوپہر کا سنسان وقت تھا اگرچہ زور شور سے پڑھ رہی تھی نظم کی نجات کے واسطے لوٹا بھر وضو کے لئے آرہی تھیں کہ یہ صدا کان میں آئی:۔

"ایک خدا کے وہ بندے ہیں جو قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں - ایک
تم ہو کہ مسلمان کو جیل خانے پہنچاتے ہو"-

لوٹا چھوڑ کو ٹھے پر گئیں، جا کر دیکھتی ہیں تو آدمیوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہے-
ایک ضعیف العمر انسان کو جس کی ڈاڑھی سفید بگلے کا پر، عدالت کے اہلکار گرفتار
کئے کھڑے ہیں - اور ایک نوعمر انسان آنکھیں نکال نکال کر برا بھلا کہہ رہا ہے بڈھا
خاموش تھا - اس کے لب پر آہ کے سوا کچھ نہ تھا - وہ تھم تھم کر ٹھنڈے سانس بھرتا تھا اور
آسمان کی طرف دیکھتا تھا - مجمع میں سے ایک شخص نے جوان آدمی سے پھر وہی الفاظ
دُہرا کر کہا۔ "یہ شخص جو آج تمہارا مقروض ہے - اس سے زیادہ بدنصیب آدمی دُنیا میں
مشکل سے ہوگا - اس کے سیاہ بال خلق اللہ کی خدمت میں سفید ہوئے اس نے
سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے یتیموں اور رانڈوں کو دیئے - محتاج اس کے در سے
سائل اس کے گھر سے خالی نہ گیا - آج سے تین سال پہلے اسکی دولت کا ڈنکا تمام
شہر میں بج رہا تھا - خدا کسی کو نہ بگاڑے - تم پر اس کے احسانات ہیں تم نے اس کا نمک
کھایا - اس نے یتیم خانہ سے نکال کر تمہاری پرورش کی - اپنے روپے سے تم کو اس قابل
کیا کہ آج تم کاروبار کر رہے ہو - کیا اسی دن کو کہ جب اس کا کاروبار بگڑ جائے - یہ برابر کے
جوان بیٹے کا جنازہ کندھے پر دھرے - اور عمر بھر کی رفیق بیوی کو گہری گود میں سُلا کر
مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ خدا کی عبادت میں مصروف ہو تو تم جھوٹے دعوے سے
روپے کا مطالبہ کرو - اور اس کو گرفتار کر لو"-

ضعیف العمر کی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی - وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا
اور نگاہ نیچی کر لیتا تھا - اس نے کچھ سوچا اور نوعمر کی طرف دیکھ کر کہا :-

"میں ماں کے پیٹ سے کچھ لیکر نہ آیا تھا - جو کچھ پیدا کیا اسی دُنیا میں اور جو کچھ ختم کیا
وہ بھی اسی دُنیا میں - جس طرح خالی ہاتھ ماں کے پیٹ سے آیا اسی طرح خالی ہاتھ

قبر میں چلا جاؤں گا - روپیہ میرے پاس بھی نہ رہا - اور تمہارے پاس بھی نہ رہے گا - مگر اس کا اثر، اس کا نتیجہ، اور اس کا طفیل میرے پاس ہے - اور تمہارے پاس ہونے والا ہے - دُنیا تماشا گاہ ہے - یہاں نت نئے تماشے اور رنگ برنگ کے کھیل انسانی زندگی دکھارہی ہے - جو ہاتھ اس وقت قیدی کی حیثیت سے دوسرے ہاتھ میں ہے - اس میں روپے کی ریل پیل تھی - اشرفیوں کا ڈھیر تھا - اور دولت کی بوچھاڑ تھی - ہم یہ سب سوانگ دیکھ چکے - اور اب مجبور ہو لاچار ہیں - میرے پاس اب کچھ نہیں - میری تمام کائنات، ساری ملکیت، کُل اثاثہ، ایک بدہنی، ایک تسبیح، اور ایک جانماز ہے - یہ اگر تمہارے کام آسکے تو شوق سے لو - خدا کی دُنیا وسیع ہے - دریا کا کنارہ میری بدہنی - ہاتھ کی انگلیاں میری تسبیح، اور جنگل کی گھانس میری جانماز ہوگی - مجھے یاد نہیں کہ میں نے تم سے یا کسی سے کبھی قرض لیا ہو - میں نے اس پیٹ میں پانیاں بھی کھائیں - اور اب سوکھی روٹیاں بھی کھاتا ہوں - مگر میں نے جب سے میرا کام بگڑا میری بات گئی، آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا - یہ ہاتھ جو اس وقت تیار ہے اس کو فخر ہے - کہ سوا اس خدا کے جس کے سامنے پانچ وقت اُٹھتا ہے کسی کے آگے دراز نہ ہوا - میں نواڑی پلنگوں پر سویا - اور آج بان کی چارپائی مجھ کو میسّر نہیں خس خانوں میں رہا - اور اب ٹوٹی جھونپڑی بھی میری ملکیت نہیں - میں ایک جوان بیٹے کا باپ اور ایک مسلمان عورت کا شوہر رہا - مگر اب نہیں ہوں - میری آنکھوں نے عیش کے جلسے دیکھے، اطمینان کی گھڑیاں دیکھیں، اور انہیں آنکھوں سے بیٹے کا مردہ دیکھا - بیوی کی لاش دیکھی لیکن خدا کی مرضی پر راضی، اور اس کے حکم پر خوش ہوں - جس طرح فرحت میں شاکر رہا - اسی طرح مصیبت میں صابر ہوں - مجھ کو تمہارے دعوے کی خبر نہ تمہارے مطالبہ کا علم - تم نے اصرار کیا کہ دعوت میں شریک ہو - میں انکار کرتا - مگر اس لئے کہ تمہاری دل شکنی نہ ہو - حاضر ہوگیا - تم نے میرے ساتھ دھوکہ دیکر یہ داؤں کھیلا

مجھے جیل خانہ بھی غنیمت ہو گا۔ اور میں جس خدا کو یہاں یاد کر رہا ہوں، وہاں بھی فراموش نہ کروں گا۔ مگر بزرگ ہوں نصیحت کرتا ہوں۔ سُنو اور یاد رکھو دُنیا فانی ہے، یہ عُمر ہمیشہ اور یہ وقت سدا رہنے والا نہیں۔ کام وہ کرو کہ نام نیک ہو۔ اور جب یہ عمر ڈھل جائے، اور یہ رنگ بگڑ جائے تو پچھتانا نہ پڑے۔

میں مفلس ہوں میرے پاس روپیہ پیسہ کچھ نہیں۔ جوڑے کے سوا جو بدن پر ہے اور دوسرا دُھوبی کے یہاں میرے پاس کپڑا بھی نہیں چلو، لے چلو جہاں سے چلنا ہے اور پہنچا دو جس جگہ چاہتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپے دے کر مجھے چُھڑانے والے قبروں میں آرام کر رہے ہیں۔ چلو بسم اللہ کرو"۔

خلقت کی آنکھ سے آنسو جاری تھے کہ چچی جان پہنچ آئیں۔ اُنہوں نے ڈیڑھ سو روپے نکالے اور چچا جان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ چچا جان کے کلیجہ پر بھی چوٹ لگی۔ وہ روپے لے کر باہر آئے۔ اور اُنہوں نے وہ روپیہ پیش کیا اور کہا:۔

"میری بیوی کی طرف سے جو کہ بٹھے پر آپ کی تقریر سُن رہی تھی یہ ناچیز رقم قبول فرمایئے۔ اور قرض میں ادا کر دیجئے"۔

ضعیف العمر کی آنکھ اب خُشک ہو چکی تھی۔ اُنہوں نے روپے کے لینے سے انکار کیا اور کہا:۔

"میں مرد ہوں مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی تکلیف کا بار ایک عورت پر ڈال دوں"۔

مگر جب چچا جان نے زیادہ اصرار کیا تو اُنہوں نے روپیہ لے کر اس جوان کو دیدیا اور ایک چیخ مار کر یہ کہتے ہوئے گر پڑے:۔

"جس دنیا میں بے گناہوں کو قید کر دینے والے مرد موجود ہیں وہاں روپیہ دیکر آزاد کرا دینے والی مسلمان عورت خدا تجھ کو دین و دُنیا میں خوش رکھے"۔

بات گئی گذری ہوئی، معاملہ ختم ہوگیا۔ جو واقعہ چچی جان دکھا گئیں اب تک زندہ ہے۔ اور گو وہ لوگ نہ رہے۔ مگر دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں۔ اور سُننے والے عرصہ تک موجود رہیں گے۔

تم نے ان کی ایک بات تو رَٹ لی۔ جس میں ان کی نیت بخیر تھی اور وہ بھی اُنہوں نے کسی لالچ یا توقع پر نہیں قرض حسنہ دیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کا خیال نہ رکھا۔ جو ان کے دامنِ حیات پر سدا بہار پھول کی طرح کھل رہا ہے۔

اٹھارواں باب

احسان ۔" یہ آخر کیا مصیبت ہے جو آج پانچ روز سے ڈاک بٹھا رکھی ہے۔ صبح ہے تو، شام ہے تو، آخر ایسا کیا ضروری کام ہے کہ گھر میں بیٹھنے کا حکم ہی نہیں۔ کہو کیا کام ہے؟ کیوں بلا رہی ہو"؟

زاہدہ ۔" اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ مجھے ایک ضروری بات دریافت کرنی ہے"۔

احسان ۔" مجھے مطلق فرصت نہیں ہو۔ دُلہن بیگم آج تماشہ میں جائیں گی۔ گاڑی کا انتظام کرنا ہے۔ میں کھڑے ہی کھڑے تمہاری بات سُن لونگا۔ کہو کیا کہنی ہو"؟

زاہدہ ۔" پرسوں عشرہ ہے کچھ نذر نیاز کروگے"؟

احسان ۔" صرف اسی واسطے بُلایا تھا۔ افسوس"۔

زاہدہ ۔" ہاں بُلانے کی غرض تو یہ ہی تھی۔ افسوس کس بات کا"؟

احسان ۔" اس لغویت اور جہالت نے تم کو یہ دن دکھایا۔ اور ابھی تک یہ حرکتیں ختم نہ ہوئیں"۔

زاہدہ ۔" اس میں لغویت اور جہالت کی کیا بات ہے؟ میں دریافت کرنا

چاہتی ہوں"۔

احسان۔ "اس سے زیادہ لغویت اور کیا ہوگی! ایسی فضول رقم کس کے پاس دھری ہے۔ کہ حاصل دین نہ دُنیا، تمہاری اماں کی طرح دو من حلیم رات بھر گھوٹے اور من بھر کی کھیر پکائے"۔

زاہدہ۔ "میں تو صرف دریافت کرتی ہوں۔ اس میں ناخوش ہونے کی کیا بات ہے؟ ان کا فعل اُن کے واسطے، تمہارا تمہارے واسطے"۔

احسان۔ "خیر تمہارے رائے کیا ہے؟ محرّم میں کیا ہونا چاہیئے۔ کیا کوئی تعزیہ میں بھی نکالوں"؟

زاہدہ۔ "نہیں یہ مطلب تو میرا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ پیسہ دھیلا، روکھی سُوکھی، جو اللہ نے دی ہو۔ شہیدوں کے نام کی نذر نیاز ہوجائے"۔

احسان۔ "تمہاری آنکھوں پر جہالت کے ایسے پردے پڑے کہ کسی طرح اُٹھ نہیں سکتے۔ آخر تم ہی جیسی عورت دُلہن بیگم ہیں۔ مگر ایک تعلیم نے خیالات میں ایسی شستگی پیدا کردی ہے کہ گھر اور زندگی دونوں جنت بنے ہوتے ہیں۔ تمہارے ہی عقیدے کے موافق امام حسین علیہ السلام جو رسولؐ اللہ کے نواسے تھے۔ جنت میں پہنچ گئے۔ اور تمہارا یقین ہے کہ سردار ہیں جوانانِ بہشت کے۔ انکی والدہ تمہاری رائے میں خاتونِ جنت ہیں۔ اب تم ہی بتادو کہ کیا وہ لوگ تمہاری اس فضول نیاز کے محتاج ہیں۔ اور اس کا نتیجہ سوا اس کے کہ تم چند الغنتوں کو کھانے کھلادو اور کیا ہوسکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان لغویات میں کیا مصلحت ہے۔ اس کی اصلی غرض صرف یہ ہے کہ مسجد کے ملّانے جنھوں نے یہ ڈھکوسلے نکالے اس بہانہ سے تر مال اُڑائیں۔ اور نذر نیاز کے مال ان کی خدمتوں میں پہنچیں۔ ایسا مفت کا روپیہ میرے پاس افسوس نہیں ہے۔ ہاں تمہارے والدین کے پاس ہے۔ تمہاری ماں جو کچھ کریں درست ہے"۔

زاہدہ۔ "تم بھی کیسے مزے کی باتیں کرتے ہو کیا محبت کا اظہار صرف حاجتمند کے ساتھ ہوتا ہے۔ خوشحال کے ساتھ نہیں ہوسکتا؟ غریب پرور آدمی اُس کی حاجت رفع کرکے احسان کرتا ہے اور امیر کی محبت ناچیز نذر سے ظاہر ہوسکتی ہے۔ ہارون نے کیا پانی کے گھڑے کی جو اعرابی لیکر آیا تھا وقعت نہ کی۔ نیت دینے والے کی دیکھنی چاہئیے لینے والے کی حیثیت نہیں۔ یوں تو خدا اور رسولؐ کے نام کی بھی نیاز ہوتی ہے تو کیا خدا اور رسولؐ ہمارے بھوکے ہیں۔ ہم خدا کے نام پر ایک اپاہج کو پیسہ دیتے ہیں تو کیا ہمارا یقین یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا ہمارے ایک پیسہ کا محتاج ہے اس کی لاانتہا دولت اس کے بےشمار خزانوں اس کی لازوال سلطنت میں ایک پیسہ کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ لیکن خلوص سے دیا اور دل سے پیش کیا جاتے تو وہی ایک پیسہ بیڑا پار کرسکتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام بے یار و مددگار میدان کربلا میں شہید ہوکر استقلال کا سچا نمونہ اور اسلام کی بےنظیر مثال دکھا گئے۔ وہ حضور اکرمؐ کے نواسے، خاتونِ جنت کے لختِ جگر ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ اس واقعہ کو زندہ رکھیں اور آنیوالی نسلوں کے دل سے اس سانحہ کو فراموش نہ ہونے دیں اس یاد کو تازہ رکھنے کی صورت سب سے بہتر یہی ہے کہ ہم اس روز ان پاک روحوں کے کارنامے خود پڑھیں اور دوسروں کو سنائیں۔ اس کے ساتھ ہی جو کچھ خدا نے ہم کو دیا ہے وہ ان شہیدوں کے واسطے جنہوں نے صداقت پر اپنی جانیں قربان کیں۔ خرچ کریں اور خدا سے التجا کریں کہ وہ پاک بندے جن پر تو اپنی رحمت نازل کر رہا ہے۔ جو ہماری نذر کے محتاج نہیں ہمارا یہ حقیر ہدیہ ان کی خدمت میں پہنچا دے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم جو دیں گے وہی ان کو پہنچے گا۔ وہ ان دنیا کے مکروہات کا کیا کریں گے۔ جنہوں نے دنیا میں انکی پرواہ نہ کی۔ وہ آخرت میں اس سے مستغنی ہیں۔ مگر ہمارا یہ فعل ان کی ہمت و صداقت کا اعتراف ہے۔ اور سب سے بڑا راز جو اس میں ہے وہ صرف اس قدر کہ اس طرح

ہم ان غریبوں کے ساتھ سلوک کر سکیں۔ جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ اور جو دو دو دانوں کو محتاج ہیں۔ میں اس مسجد کی خدمت جس کی اذان کان میں آئے فرض سمجھتی ہوں۔ لیکن ہرگز ہرگز ان موٹے مشٹنڈوں کو دینا ثواب نہیں سمجھتی جو دھڑلے سے بھیک مانگتے ہیں۔ اور مزے کرتے ہیں۔ پردہ نشین رانڈیں ہیں، یتیم بچے ہیں، مسکین طالب علم ہیں، محتاج اپاہج ہیں۔ میرے خیال میں اس گروہ کا ہم پر ضرور حق ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم کسی طرح زکواۃ سے، خیرات سے، صدقات سے، ان حاجتمندوں کی اعانت کریں۔ نذر نیاز سے غرض بھی ان ہی حاجتمندوں کی اعانت ہے۔ اور اس لئے میں نے تم کو تکلیف بھی دی"۔

احسان۔ "یہ فضول باتیں ایسی ضروری نہ تھیں کہ مجھ کو اس طرح تکلیف دی جاتی۔ آیندہ احتیاط کرنا۔ اب میں جاتا ہوں"۔

انیسواں باب

"جب تک اماں جان زندہ رہیں۔ میں نے اس وقت تک آپ کو ان سے کم نہ سمجھا، اور آپ کی رائے اور قیاس کی ہمیشہ وقعت کی اور اب کہ اماں جان جنت سدھاریں میری ماں آپ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کہنے کو نہیں واقعی آپ میری ماں ہیں۔ اس وقت کوئی بڑا بوڑھا ایسا نہیں جو ہم کو نشیب و فراز سمجھائے۔ بڑے صاحب ہیں، وہ نور علیٰ نور ہم کچھ ہو چکا۔ مگر وہ صاحبیت ابتک ختم نہ ہوئی۔ اماں جان بھی اللہ بخشے اس کی ہمیشہ شاکی رہیں۔ میری غلطی تھی کہ ابتدا میں آپ کی رائے کو مناسب نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ بھگت لیا۔ اب آپ اس وقت تشریف لے چلئے اور خود چل کر جو مناسب سمجھئے وہ کیجئے"۔

ساس۔ "میاں یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ اور میں ہر طرح سے

تمہاری تجویز سے متفق ہوں ۔ میں تو کل بھی اسی واسطے وقت پر پہنچ گئی تھی کہ تم ناتجربہ کار ہو۔ کسی بات میں کسر نہ رہ جائے اللہ کا شکر ہے جو اصلی کام تھا وہ اللہ نے پورا کر دیا ۔ اب جو کچھ ہے وہ دنیا کے جھگڑے اور بہوت کی جوت ہے ۔ پھولوں کی بحث کل بھی میں سن آئی ۔ تمہارے والد صاحب قبلہ اور تمہاری بیوی کا خیال تھا کہ پھول فضول ہیں ۔ تمہاری پھوپھی اور خالہ دونوں بیبیوں کی رائے تھی کہ ہوں اور ضرور ہوں ۔ مجھ سے کسی نے صلاح نہ لی ۔ نہ میں نے خود دخل دینا مناسب سمجھا"۔

حسن ۔" جی ہاں تو اِن ہی باتوں کے طے کرنے کے واسطے تو آپ کی ضرورت ہے ۔ اور تمام فیصلہ آپ کی رائے پر منحصر ہے "۔

حسن ساس کو لے کر گھر آیا تو عورتیں بھری تھیں ۔ اور مختلف بیبیوں کی مختلف رائے تھی ۔ کوئی کہتا تھا پھول ہوں ۔ کسی کی رائے تھی نہ ہوں ۔ بالآخر حسن کے والد نے دروازہ پر آکر سمدھن سے کہا کہ "پھولوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور اس رسم کا مردہ سے کیا تعلق ہے"؟

سمدھن ۔"میں اس رسم کا مردہ سے کوئی تعلق نہیں سمجھتی ۔ اور یہ وہ رسمیں ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تاراج و برباد کر دیا ۔ اور اس کا تمام بار اِن مسلمانوں کی گردن پر ہے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں اپنے پیٹ بھرے اور نفس کے کارن دوسروں کی تباہی کو جائز سمجھا ۔ جس دھڑلے سے ، جس دریا دلی سے ، اور جس اطمینان سے یہ رسم ادا کی جاتی ہے ۔ اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے ۔ اور جس شوق سے ، جس رغبت سے ، اور جس محبت سے ، اڑانے والے ان کھانوں کو اڑاتے ہیں ۔ وہ کچھ تعجب انگیز نہیں ۔ افسوس اس کا ہے کہ وہ مسلمان جن کا کام خلوص و ہمدردی تھا ۔ صداقت سے اتنے دور ہو گئے کہ دوسرے گھروں کی آگ سے انہوں نے ہاتھ تاپنے جائز سمجھے ۔ مائیں جوان بیٹیوں کے لئے اور اولاد ماں باپوں کے لئے سر ٹکرائیں مگر یہ سنگدل بریانی تنجن

اڑا کر تو نہ دوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈکاریں لیں۔ اس رسم کی غرض صرف اتنی تھی کہ زندے مُردے کو فراموش نہ کریں۔ اور چونکہ صدمہ تازہ ہے۔ گلی میں روپیہ عزیز نہ کریں۔ خدا کی اس مخلوق کے کام آئیں جو اپنی زندگی فاقوں میں بسر کر رہی ہے۔ اور یہ یقین کریں کہ جس طرح وہ محتاج بندگان خدا کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ اسی طرح خدا ان کے عزیز پر رحم کریگا۔ جو اب صرف خدا ہی کی اعانت کا محتاج ہے۔ یہ محتاج وا پاہج وبیکس جو واقعی حاجتمند ہیں وہ ہونگے جن کو سوکھی روٹیاں بھی بریانی سے زیادہ اور مزعفر سے بڑھ کر ہیں۔ نہ کہ جو گھی میں تلخی اور گوشت میں خرابی کا امتیاز کریں۔

ایسے لوگوں کو کھانا کھلانا اس قدر فضول، اس قدر لغویت اور اس قدر زبردست غلطی ہے کہ خدا ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اسی طرح مسلمانوں کا جمع کرنا بھی کچھ کم نادانی نہیں۔ تفا باتش ہے ان بلانے والوں پر۔ اور صد آفریں ان آنے جانے والوں پر جس قوم کی اخلاقی حالت اس قدر کمزور اور ایسی قابل ملامت ہو جائے اس میں جو کچھ بھی ہو وہ خلاف توقع نہیں۔ جو عورتیں اس ماں سے جس کا کڑیل شیر بچہ دنیا آنکھوں میں اندھیر کر گیا۔ یہ توقع رکھتی ہیں کہ کھانے پینے کی مدارات میں کمی نہ کرے۔ اگر ان کے مرد جوا چوری دغا اور فریب کرتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ ضرورت تو صرف اتنی تھی کہ ایک گھر میں موت ہوئی۔ صاحب خانہ کے عزیز اقارب اپنا اپنا کھانا لیکر اس کے پاس آئے۔ خود بھی کھایا اس کو بھی کھلایا۔ اس کا دل بہلائیں اور اس کے صدمہ کو زائل کرنے کی کوشش کریں نہ کہ یہ ستم توڑیں جو مسلمان آجکل اس رسم کی بدولت توڑتے ہیں۔

لیکن میری بحث کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ پھولوں کی رسم قطعاً اڑا دی جائے۔ میں اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ مذہب سے اس کا واسطہ کچھ نہ ہو۔ لیکن یہ ہمارے وہ [illegible] ہیں جن کے مٹانے سے ہم خود اگر نہ مٹیں گے تو مٹنے سے بدتر ہو جائیں گے۔ ہم زندہ رہیں گے مگر اسلام ہم میں نہ ہوگا۔ میرا کہنا بظاہر تعجب انگیز ہے اور میں خود

اس رسم کی حمایت کر رہی ہوں جو ہماری بربادی کا پیش خیمہ ہے لیکن اسلام کے احکام ثابت کر رہے ہیں کہ ان کا منشا زیادہ تر یہ ہے کہ مسلمان باہمی محبت و اخوت سے زندگی بسر کریں۔ دولت مند اپنی دولت میں مست ہو کر حاجتمندوں کی تکلیف سے بے خبر نہ ہو جائیں۔ یہی غرض زکوٰۃ اور خیرات کی ہے کہ امیروں کی کمائی سے غریبوں کو بھی حصہ ملے۔ پھولوں کی رسم کا ماحصل بھی رکھنے والوں نے یہی رکھا ہے اور یہ ہمارا یقین ہے کہ خدا کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ جب ہم بلبلا کر اور گڑگڑا کر اس سے التجا کریں گے تو وہ ہماری دعا سنے گا۔ اور جو کچھ ہم اس کی راہ میں دیں گے قبول کریگا۔ اور دینے والے پر جو اپنے اعمال و افعال کی جزا و سزا میں مصروف ہے رحم فرما کر اس کو عذاب سے رہائی دیگا۔ مگر کیا میں یہ کہتی ہوں کہ پھولوں کی رسم جس طرح ادا کی جا رہی ہے اسی طرح ادا کی جائے؟ توبہ توبہ۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ قرض لے کر پھول کرنے اور حیثیت سے بڑھ کر کھانا پکوانا گناہ سخت گناہ۔ میری غرض صرف اتنی ہے اور جیساکہ میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ میت کے وارث اس وقت دل کی لگی میں تو سب کچھ کرلیں گے۔ اور بعد میں جب صدمہ زائل ہوگیا تو پھر کون کسی کو پوچھتا ہے۔ اور کون کسی کو دیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ جس طرح زندگی میں بچہ کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح جو کچھ خدا نے اس کو دیا ہے معمولی کھانا۔ جو وہ روز کھاتی اور کھلاتی تھی اب بھی پکاتے۔ شوہر جس طرح بیوی کی موجودگی میں کھانے پینے کا انتظام اپنی حالت کے موافق کرتا تھا۔ اب بھی کرے اور یہ معمولی کھانا ان رانڈوں کو جن کی گودوں میں یتیم بچے ہیں۔ ان یتیموں کو جن کا پیٹ بھرنے والا خدا کے سوائے کوئی نہیں اپنے پاس بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔ اگر آپ اس طرح پھولوں کی رسم انجام دیں اور یہ اہتمام کریں کہ حاجتمندوں کے سوا دوسرے کو جو واقعی حاجت مند نہیں کھانا نہ دیا جائے تو اس کو ضرور انجام دیجئے۔ اور یہ رسم اس صورت میں آکر یہ حق رکھتی ہے کہ برقرار رکھی جائے۔ افسوس

اس بات کا ہے کہ اس رسم کی جس قدر مخالفت ہورہی ہے گو وہ مخالفت کے قابل ضرور ہے۔ مگر مخالفین اس کے ساتھ ہی اس کی اصلیت کو بھی پامال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اخوت اسلامی کے جوہر بھی زائل ہونگے۔ اور رفتہ رفتہ اس مذموم رسم کے ساتھ ہی ہمدردی کا درخشندہ جوہر بھی خاک میں مل جائیگا۔"

سمدھن کی گفتگو سُنکر باپ اور حسن دونوں اسی صلاح پر متفق ہوئے۔ کہ پھولوں کی رسم اس طرح ادا کی جائے کہ کھانا گھر میں پکایا جائے اور حسن اپنے ہاتھ سے لے جاکر ان پردہ نشین رانڈوں کی خدمت میں پیش کرے جن پر کڑاکے کے فاقے پڑ رہے ہیں۔ اور اس رسم کا خاتمہ اسی دن ختم نہ ہو بلکہ ہمیشہ چار آدمیوں کا کھانا دونوں وقت ایسے لوگوں کو دیا جاتے جو واقعی حاجتمند ہیں۔

سمدھی اور داماد سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ماں بیٹی کے کمرہ میں آئی جو آپ علیحدہ مکان سے اُٹھ کر ساس کے پاس آگئی تھی۔ دیکھتی ہے تو شاہدہ ایک آرام کرسی پر پڑی جھول رہی ہیں۔ اور کمرہ میں کتے لوٹ رہے ہیں۔ چاندنی سکڑی ہوئی، دری لتھڑی ہوئی، کاغذ بکھرے ہوئے، کوڑا پھیلا ہوا۔ کمرہ کیا کاچھی کی دوکان ہے کہ چاروں طرف ہر قسم کا اسباب موجود ہے۔ آج بیٹی نے اتنی عنایت تو ضرور کی کہ ماں کو اُٹھ کر کھڑے ہوکر نہیں۔ بیٹھے ہی بیٹھے، اور لیٹے ہی لیٹے، آداب یا تسلیم اور سلام نہیں ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ماں نے دُعا دی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا:۔

"بیٹی یہ اتنی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ اگر کوئی اِدھر آگئی تو کیا کہے گی۔ کمرہ بھی ٹھیک نہ کیا"۔

شاہدہ۔" دونوں ماماؤں میں سے ایک بھی کمبخت آج نہ آئی۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ کس قدر اشد ضرورت ہے"۔

ماں۔" ہاں یہ غلطی تو ماماؤں کی ضرور ہے۔ لیکن اسی دن کو تو کہتے ہیں کہ ہم کو

تمام کاموں کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک روز ماما یا نوکر بیمار پڑ جائے تو ہاتھ ہی کٹ جائیں۔ یہ لوگ کچھ آج ہی پیدا نہیں ہوئے۔ پہلے بھی نوکر چاکر ہوتے تھے۔ اور ہم نے بھی نوکروں ہی میں آنکھ کھولی۔ مگر ہماری بڑی بوڑھیوں نے نوکروں کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ ہماری زندگی کا تمام دارومدار ان پر ہے۔ اور یہ ہیں تو سب کچھ، اور نہیں ہیں تو کچھ نہیں۔ باوجود یہ سمجھنے اور ان پر بھروسہ نہ کرنے کے محبت کے تعلقات ایسے ایسے تھے کہ مامائیں مرکر اور نوکر مجبور ہی ہوکر گھر سے نکلتے تھے۔ یہ نہ ہوتا تھا کہ آج کلّن کی اماں روٹی پکا رہی ہے تو پرسوں مرزا کی بہن۔ روز ماماؤں کی بدلی آتی ہے۔ میں نے تو کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے پاس برسوں کی ماما عام طور پر دیکھی نہیں۔ آج یہ ہے تو کل وہ مرنے والیوں میں یہ کمال تھا کہ انس اُلفت اور اس محبت پر کہ ماماؤں کو اپنے عزیز کے برابر اور رشتہ دار سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان پر بھول کر گھر کے کام کاج کو بھول جائیں۔ وہ ماماؤں کو اپنا مددگار سمجھتی تھیں۔ کام خود کرتی تھیں اور مدد ان سے لیتی تھیں۔ میں نے اپنی ان ہی آنکھوں سے اُن جنتی بیویوں کو دیکھا ہے جن کے بچے اشرفیوں میں کھیلتے تھے۔ اور پیسوں کی جگہ روپے اُٹھاتے تھے۔ مگر میں نے تو ہمیشہ یہ دیکھا کہ ماما کے آنے سے پہلے گھر چندن کرکے رکھدیا۔ اپنے ہاتھ سے جھاڑو بہارو اپنے ہاتھ سے ٹھنڈا گرم پانی۔ ماما آئی اس نے اور کام کئے۔ اس کے ساتھ ہی باورچی خانے میں گھُسیں اور جب تک کھانا تیار ہوا لگی لپٹی رہیں۔ مامائیں ان کی مددگار ضرور تھیں۔ مگر وہ ماماؤں کی محتاج نہ تھیں۔ تعجب ہے کہ تمہارا دل کس طرح اس کوڑے پر بیٹھنے کو چاہتا ہے۔ مجھ سے تو دم بھر بھی نہ بیٹھا جائے۔ اسی لئے تو بارہ مہینے ریجھتی رہتی ہو۔ اٹھنے سے تم کو وحشت، کام سے تم کو نفرت، صحت بگڑے گی نہیں تو سنورے گی؟ لاؤ جھاڑو دو میں دوں۔ یہ غضب بھی کہیں دیکھا کہ گھر میں عورتیں آتی ہوں اور بہو کے کمرے کا یہ ہڈّرا!

شاہدہ ۔ "مجھے تو معلوم نہیں وہ کمبخت کہاں جھاڑو رکھ جاتی ہے"۔

ماں نے چاروں طرف دیکھا مگر جھاڑو نہ ملی۔ مجبور بچاری نے ایک میلے کپڑے سے جھاڑو کا کام لیکر گھر کو ٹھیک کیا اور کہنے لگی :۔

"کہو بیٹی تم نے ساس کو کیا بھیجا۔ اللہ بخشے کیسی خوبیوں کی بیوی تھیں جس طرح مجھ سے کہا تھا کہ سدا بیٹی سمجھوں گی۔ اسی طرح نباہ گئیں! ہمیشہ رہے نام اللہ کا"۔

شاہدہ ۔ "تعجب ہے کہ آپ ان کی بھی تعریف کر رہی ہیں جن کو کوئی اچھا نہیں کہتا۔ مجھ کو تو انہوں نے ہمیشہ دشمن سمجھا اور دشمن رہیں۔ آپ ان کی تعریف کرتی ہیں کمال ہے۔ میں ان کو کیا پہونچاؤں گی۔ میرا بس چلے تو جو کچھ ان کو وہاں ملے وہ بھی چھین لوں"۔

ماں ۔ "موت ان ہی کو نہیں آئی جس نے ماں کا پیٹ دیکھا وہ گور کا منھ ضرور دیکھے گا۔ تم کو بھی اور مجھ کو بھی ایک روز یہ ذائقہ چکھنا ہے۔ مگر کسی کو برا کہنے سے پہلے یہ تو سوچو کہ آخر تم نے بھی کچھ ایسے کام کئے کہ لوگ تم کو اچھا کہیں۔ وہ تمہاری بزرگ تھیں، تمہارے کرتوتوں سے جلتی اور کڑھتی تھیں اس لئے خفا رہتی تھیں تم انکو مرنے کے بعد برا کہتی ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ مردے کو برا کہنا اچھا نہیں۔ اسکو بھلائی سے یاد کرو کہ وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہو جائے۔ کیونکہ جو آدمیوں میں اچھا ہو وہ خدا کے ہاں بھی اچھا ہے۔ دنیا میں وہ تمہاری دست نگر تھیں۔ لیکن آج وہ تمہاری محتاج ہیں۔ ان کا تم پر یہ حق ضرور ہے کہ تم جو کچھ تمہارے ہاتھ سے، پاؤں سے، زبان سے ہو سکے انکی خدمت کرو۔ میں عشا کے بعد اس وقت تک نہیں سوتی جبتک اپنے سب عزیزوں کو تھوڑا تھوڑا پڑھ کر نہ پہنچا دوں۔ ایک سورۂ یوسفؑ اور ایک سورۂ بقر تو روزانہ ہوتی ہے کہ اس کا ثواب ان مرنے والوں کو پہونچے۔ تم اس ثواب کی بھی قائل نہ ہو گی۔ مگر اس کی قلعی اس وقت کھلے گی جب عزیز گھر کی گور اور جنگل بیابان میں سلا کر گھر چلے آئیں گے۔

میرے پیٹ کو یہ آگ لگی کہ تم جیسی بچی پیدا ہوئی جو نہ زندوں کی نہ مردوں سے

بھی نہ ڈرے کمبخت ڈر خدا سے مرنے کو مرنا سمجھ اور اس وقت کی بھی کچھ تیاری کر
جب یہ شوں شاں اور یہ دھوم دھام خاک بھی کام نہ آئے گی۔ اسی واسطے اللہ بخشے
مرنے والے اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ بچوں کی زبان سے کسی نہ کسی طرح خدا کا
مقدس کلام ادا ہوتا رہے۔ اماں جان عورت ہیں۔ مگر جس حافظ سے جی چاہے مقابلہ
کرلو۔ ذرا سی غلطی پر فوراً ٹوک دیں گی۔ ایک تم بھی مسلمان اور مسلمان کی اولاد ہوکہ درود
شریف بھی صحیح پڑھنی نہیں آتی ہو گی۔ اللہ رحم کرے"۔

بیسواں باب

"ایک مصیبت تو یہ آئی ہی تھی کہ نوکری چھوٹی، اب اس پر غضب یہ ہے کہ
ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ۔ دلہن بیگم میرے ساتھ چل نہیں سکتیں۔ ان کے والدین نے
صاف انکار کردیا۔ اب میرا ایک ایک دن یہاں آفت ہو۔ میں نے جو کیا وہ بھگتا اب اپنی
غلطی پر نادم اور عقل پر روتا ہوں۔ میں نے دوسرے نکاح کا مزہ چکھ لیا۔ اور اس وقت
اس نیک بخت نے صاف طور پر کہہ دیا کہ "میں اپنے ماںباپ چھوڑ تمہارے ساتھ ایسی صورت
میں پردیس جاکر کیا کروں۔ کہ تم خود بیکار ہو۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہوجاتے تو بلا
لیتا"۔ چار سو روپے جمع کئے اور رکھوائے، اس وقت مانگے تو وہ اور ان کے ماںباپ
سب جان کو آگئے کہ "شرم نہیں آتی۔ یہ کیا پیچھے بیٹھ کر فاقے کرے گی؟"

زاہدہ ۔" یہ تو وہ جانے اور اس کا کام۔ قرضہ جو ڈیڑھ سو کا ہے۔ وہ تم ادا
ادا کردو۔ دس روپیہ مہینے کے حساب سے جو تم مجھ کو کپڑا لتہ اور پان چھالیہ وغیرہ کا
دیتے تھے وہ یوں کا یوں ہی رکھا ہے۔ میں نے تو کوئی بارہ تیرہ روپے اٹھائے ہیں۔
یہ روپے حاضر ہیں شوق سے لیجاؤ اور دیدو"۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجاتے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ احسان اگر پہلے ہی

موقعہ پر جب بہاری بیں دونوں بیویوں نے تعلیم قدیم وجدید کے نمونے پیش کیے کوئی نتیجہ نکالنا چاہتا تو اسے صاف معلوم ہو جاتا کہ یہ موجودہ تعلیم نسواں جب تک مذہب کے رنگ میں نہ آئے خواتین اسلام کے جوہر پامال کرتی رہے گی۔ اس وقت البتہ اس کو ایک جھٹکا لگا۔ اور اس کے دل نے بیساختہ صدا دی کہ زاہدہ پرستش کے قابل بیوی ہے کہ میرے تمام مظالم برداشت کیے اور اُف نہ کی۔ یقیناً اس نئی دلہن کی شرارت تھی کہ ایسی سیدھی اور بھولی بیوی کو اس طرح بدنام کیا۔ ابھی یہ فیصلہ یک سو نہ ہوا تھا کہ بیوی نے رومال کی پوٹلی ہاتھ میں لاکر دی جس میں روپے بندھے ہوئے تھے۔ منصفانہ نظریں اٹھیں۔ اور ندامت کے ساتھ بیوی کے چہرے پر پڑیں۔ تو دیکھا نوکروں پر راج کرنے والی بیگم آج شوہر کے طفیل اس حالت میں ہے کہ کرتہ میں پیوند اور دوپٹہ میلا چکٹ!

بیتاب ہو گیا۔ آنکھ میں آنسو آ گئے۔ باہر آیا اور چیخیں مار مار کر رو دیا۔ رو چکا تو آنسو پونچھے۔ قرضہ کا روپیہ ادا کیا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح بیوی سے جا کر اپنی گذشتہ خطاؤں پر ندامت کا اظہار کروں۔ اور معافی کا طلب گار ہوں کہ ایک لڑکے نے سامنے سے آکر خط دیا۔ کھولا تو لکھا تھا:۔

"ڈیر احسان!

میرے اس وقت کے ساتھ نہ چل سکنے کو تم امر مجبوری سمجھنا۔ میں جس طرح تمہاری فرمانبردار ہوں۔ اسی طرح والدین کی مصلحت یہ ہی تھی اور ہے۔ میں مسلمان ہوں اور حقوق اسلام کے بموجب تمہاری زندگی کی شریک۔ کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہ کرتی۔ مگر اس مصلحت کا نتیجہ تم کو جلد معلوم ہو جائے گا۔ جس وقت بلاؤ گے میں اسی وقت سر آنکھوں سے حاضر ہوں گی۔ ہاں ایک بات کا انتظام

کرنے جاؤ۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی۔ مگر یہ مجھ سے زیادہ
تمہاری عزت کا سوال ہے۔ دسمبر کے چوتھے ہفتہ میں انجمن
خواتین ہند کا اجلاس ہے۔ اور میرا نام شائع ہو چکا ہے۔ تم
سمجھ سکتے ہو ایسی حالت میں میرا جانا کس قدر ضروری ہے۔ اس
وقت تک تو میرا خیال یہ ہے کہ موت کے سوا کوئی طاقت مجھ کو
وہاں جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے میں سب سے پہلے تم کو اطلاع
دیتی ہوں۔ کیونکہ میں اس کو نہایت ضروری خیال کرتی ہوں اور اس کے
بعد ایک اور اشد ضرورت پر متوجہ کرتی ہوں۔ اور وہ یہ کہ جلسہ کی شرکت کے
قابل میرے پاس کوئی لباس نہیں۔ وہاں لیڈیز روزانہ کپڑے بدلتی ہیں۔ میں
کم از کم چار روز میں تو دو جوڑے سے تبدیل کروں۔ زیور تو خیر خدا کا دیا ہوتا تو
اچھا تھا۔ نہیں ہے تو اب چوری تو کرنے سے رہے۔ ہاں کپڑا تو ذرا ڈھنگ کا ہو
کہ کسی کی نظر میں حقیر نہ ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ مجھ کو مصالحہ وغیرہ سے نفرت
ہے۔ میں ایسی جگہ ہرگز روپیہ صرف کرنا پسند نہیں کرتی جہاں روپیہ کا پیسہ بھی
نہ رہے۔ البتہ جو ضروری چیزیں ہیں ان سے مفر نہیں۔ دو جوڑے زیادہ
سے زیادہ ڈیڑھ سو روپیہ میں تیار ہو جائیں گے۔ اگر تم بزاز کا حساب
بیباق کرو تو اس رقم کے ساتھ ہی اس کا بھی فکر کر لینا۔ اور اگر اس میں دقت
ہو تو میں ہرگز ہرگز تمکو اذیت دینی نہیں چاہتی۔ تم اسی سے قرض کا انتظام
کرا دو وہاں سے بھیجدینا۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی اباجان سے کہہ دیتی وہ بنوا دیتے۔
اور میں نے یہ ہی سوچا بھی تھا۔ مگر اب جو غور کرتی ہوں تو مجھ کو ایسی درخواست
کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میری طبیعت کچھ ایسی ہی لے کر آئی ہوں کہ ناجائز
مطالبہ کو پسند نہیں کرتی۔ مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ اپنے اخراجات ان کے

اُوپر ڈال دوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم کو مفصّل کیفیت سناؤں۔ میں اگر معمولی لباس میں شریک ہوتی اوّل تو خدانخواستہ ہونے ہی کیوں لگی۔ تو مجھ سے زیادہ تمہاری آبرو پر پانی پھر جاتا۔ میں اس موقعہ پر خاموش بھی ہو جاتی۔ اور ٹال دیتی۔ مگر خدا خدا کر کے تو سال بھر میں یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ کچھ قوم کی خدمت ہو سکے۔ اور شاید یہی کام خدا قبول فرمائے۔ دوسرے مسلمانوں کی جو حالت ہو رہی ہے اور کی تو نہیں کہہ سکتی۔ میری کیفیت یہ ہے کہ دیکھ دیکھ کر تڑپتی ہوں۔ اُمید ہے کہ یہ تجویزیں ضرور کارگر ہوں گی۔ اور مسلمان عورتیں جہالت کے گڑھے سے نکل کر علم کی روشنی سے منوّر ہوں گی۔

تم کو اس کے انتظام میں اگر زیادہ تردّد ہو تو میں ایک اور تدبیر بتاتی ہوں۔ تمہاری بیوی صاحب کے پاس بہت سا زیور ہے جس کو وہ ہمیشہ دوسرے کی امانت بتاتی ہیں۔ حالانکہ میں خود اُن کو استعمال کرتے دیکھ چکی ہوں۔ وہ اس قدر کافی ہو کہ تمکو سال دو سال بھی نوکری نہ ملے تو پریشانی نہ ہوگی۔ اس میں سے تم ڈیڑھ سو روپیے کا انتظام کر سکتے ہو۔ میں نے خود ہی یہ پرچہ تمکو لکھا ہے۔ ابھی گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ابّا جان تمہارے پاس آنے کا قصد کر رہے تھے کہ لڑکی کے اخراجات کا انتظام عدالت کے ذریعہ سے کریں مگر میں نے ان کو روک دیا اور کہا کہ اب اس کا فکر نہ کیجئے۔ میں نے ان کو منع کر دیا۔ مگر تم جس طرح ہو اس کا انتظام آج ہی کر دو۔ ایسا غضب نہ کرنا کہ یوں ہی چلے جاؤ۔ کیونکہ ابّا جان کی عادت سے تم واقف ہو وہ پھر روکے نہ رُکیں گے۔

ایس۔ احسان

خط کے پڑھتے ہی احسان کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور ہوش جاتے رہے۔ اٹھا۔ ایک سرسبز شاداب قطعہ پر جہاں سبزہ کا مخملی فرش چاروں طرف پھیلا ہوا تھا جا بیٹھا۔ اور سوچنے لگا کہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا میں تو سمجھا تھا کہ سکول کی تعلیم پائی ہوئی بیوی میری زندگی درست کردیگی۔ مگر یہ کمبخت تو سانپ کی چھچھوندر ہوگئی۔ کچھ ایسی پڑھی لکھی بھی تو نہیں۔ فقط لباس اور گفتگو ہی تعلیم کی دیکھ لو۔ زاھدہ کی قابلیت اس سے ہزار درجہ اور اس کی عادتیں و خصلتیں اس سے لاکھ مرتبہ افضل ہیں۔ اب اس خط کا کیا جواب دوں۔ یہ تو ایسے شوہر پشت لوگ ہیں کہ اگر انکار کرتا ہوں تو نہ معلوم کس مصیبت میں ڈلوا دیں گے۔ خیر اب ایک صورت ہے کہ میں بھی چالاکی سے کام لوں اور کسی طرح ان مکاروں کے پھندے سے نکل کر گھر پہنچوں۔ وہاں پہنچکر تو میں انکی ہوشیاری و مکاری سب سمجھ لونگا۔ لیکن اس معاملہ میں زاھدہ کی صلاح ضروری ہے۔

یہ فیصلہ کر احسان گھر آیا تو زاھدہ کی صورت ظاہری ایک نشتر تھا جو اس کے کلیجہ میں گھسا۔ وہی بیوی جو سچ مچ کی بیگم تھی۔ اسوقت لونڈیوں کے پردے میں نظر آئی خیال کیا تو اس تمام انقلاب کا ذمہ دار احسان اور صرف احسان۔ زیادہ غور کرنے لگا تو نفس نے ملامت کی اور بآواز بلند کہا کہ اس تغیر پر بھی اس کے جوہر اسی آب و تاب سے چمک رہے ہیں۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس وقت تک کسر نہ کی اور اب تک کہ میں نے اس کو ان حالوں پہنچا دیا۔ اسی طرح میری عزت کی خواہاں اور میرے بھلے کی جویا ہے۔ آگے بڑھا اور وہ خط دکھا کر کہا :-

"لو اب بتاؤ میں کیا کروں"؟

زاھدہ نے خط پڑھا اور کہنے لگی :-

"ان کا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح یہ تو تم ہی فیصلہ کرو مگر اس میں کیا کلام ہے کہ اب

وہ اپنی ضرورتوں کا اظہار تم سے نہ کریں تو کس سے کریں"۔

احسان ۔ "تو کیا تم اس پر رضا مند ہو کہ میں تمہارے زیور میں سے ڈیڑھ سو روپے دیدوں"۔

زاہدہ ۔ "میں تمہاری ضرورت کے مقابلہ اور تمہارے حکم کے سامنے انکار کی مجال تو نہیں رکھتی۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ وہ چونکہ میری ملکیت نہیں اس لئے مجھے اس کے دینے کا بھی حق حاصل نہیں۔ تمہاری ملکیت ہے"۔

احسان ۔ "پھر کیا کرنا چاہیئے۔ افسوس یہ ہے کہ میں دونوں جہان سے گیا۔ تمہاری تکلیف کا بار میری گردن پر سخت ہے۔ اور مجھے اس کا صدمہ ہے کہ میں نے غلطی کی"۔

زاہدہ ۔ "میرا تو تم مطلق خیال نہ کرو۔ میں جس طرح پہلے تمہاری لونڈی تھی آج بھی ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گی"۔

احسان نے دل میں کچھ فیصلہ کیا۔ اور بیوی سے صرف اتنا کہہ کر باہر آیا: "اسباب وغیرہ باندھ لو"۔

گاڑی کرایہ کی کی اور کہا "مغرب کے بعد لے آنا"۔ شام ہوتے ہی احسان زاہدہ سمیت گاڑی میں بیٹھ روانہ ہو گیا۔

مغربی تعلیم یافتہ بیوی کا دھڑکا ٹیکے سے کم نہ تھا۔ رستے بھر احسان کو کھٹکا رہا کہ اب کوئی آیا۔ اور گاڑی روکی۔ صبح چار بجے کے قریب اسٹیشن پر پہنچے تو سردی خوب شدت سے تھی۔ مسافر خانے کے کمرے میں لیجا کر بیوی کو ٹھہرایا۔ یہاں ایک لمبی تپائی پر ایک مسلمان خاتون لیٹی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھوں پر عینک تھی۔ اور لباس کی کوئی چیز انگریزی عورتوں سے کم نہ تھی۔ ہاتھ میں کتاب تھی۔ اور نگاہ نیچے۔ ایک عورت فرش بچھائے اور اپنے بچہ کو لٹائے بیٹھی تھی۔ زاہدہ کا خیال تھا کہ پڑھی لکھی بیوی اسکی عزت دیکھ کر

اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ تپائی چونکہ سرکاری ہے کم سے کم اتنا تو کہیں گی آئیے بیٹھ جائیے۔ مگر اس کا خیال پورا ہونا تو درکنار اُن بیوی نے نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ زاھدہ نے دوسری طرف دیکھا تو دوسری تپائی اسباب سے رُکی ہوئی تھی۔ دوسری بیوی سے پوچھا "یہ اسباب آپ کا ہے"؟

عورت۔ "جی نہیں اِن میم صاحبہ کا ہے"۔

تعلیم یافتہ۔ "کیوں آپ کا کیا مطلب ہے"۔

زاہدہ۔ "میں بیٹھنا چاہتی ہوں"۔

تعلیم یافتہ۔ "آپ نیچے بیٹھ جائیے۔ یہ بنچ آپ دیکھتی ہیں رُکی ہوئی ہے۔ مہربانی فرما کر دروازہ کھول دیجئے کہ تازہ ہوا آتی رہے"۔

اتنا کہہ کر تعلیم یافتہ بیوی نے کتاب پڑھنی شروع کی۔ کتاب تو اُردو ہی کی تھی۔ مگر الفاظ یہ تھے:۔

اے۔ کیٹ۔ رین

A Cat ran

وس بُک از مائن

This book is mine

زاھدہ کو ناگوار تو بہت ہوا زیادہ تر اس لئے کہ اتنی انگریزی وہ بھی سمجھتی تھی۔ جلی بھی اور ہنسی بھی۔ مگر ضبط کیا اور دروازہ کھول دیا۔

تعلیم یافتہ۔ "تھینک یُو"۔

عورت۔ "ایک ذرا ادھر کا کواڑ بھیڑ دیجئے کہ ہوا بہت تیز ہے اور میرا بخار زدہ بچہ اُچھلا پڑتا ہے"۔

تعلیم یافتہ۔ "میں نے آپ سے کہا کہ ایک آپ کے بچہ کی وجہ سے دوسرے

بیمار نہیں ہو سکتے۔ آپ دیکھتی ہیں کہ تازہ ہوا کے داخل ہونے کا یہاں کوئی راستہ نہیں۔ صرف یہ دو روشندان ہیں جو کافی نہیں ہو سکتے۔ یہاں آدمی چار ہیں ہم کو کافی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کاربن ہی رہیں۔" آپ کو کوئی حق نہیں کہ اپنے بیمار بچہ کو لیکر سفر کیجئے۔ اور دوسروں کو اذیت پہنچائیے"

عورت۔" نہیں بی بی میں تو تکلیف نہیں پہنچا رہی۔ آپ دیکھ لیجئے یہ بچہ بخار میں جل رہا ہے۔ ہوا اس کے واسطے زہر ہے۔ آپ کی اجازت نہیں ہے تو کواڑ کھلوا لیجئے۔ میں اس کو دبکا کر اوپر منہ کر لوں گی"۔

زاھدہ نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو بچہ بخار میں لوتھ تھا۔ اور کھانسی اس شدت کی تھی کہ نیلا پڑا جاتا تھا۔

تعلیم یافتہ۔" آپ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس بچہ کی اس طرح کھانسی سے مجھ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اس کو بیمار کہتی ہیں۔ مگر اس کے کھانسنے کی آواز شیر سے کم نہیں"۔

عورت۔" بی بی یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں کھانسی روک لوں۔ میں مجبور ہوں"۔

تعلیم یافتہ۔" آپ باہر جائیے۔ دیکھئے وہ برابر کھانس رہا ہے۔ اور یہ بھر میں کیسی خطرناک آواز نکل رہی ہے"۔

خانساماں نے آواز دی کہ "چائے حاضر ہے"۔

تعلیم یافتہ۔"لے آؤ"۔

خانساماں اندر آیا۔ عورت اور زاھدہ اوٹ کر کے بیٹھ گئیں۔ اور تعلیم یافتہ نے چائے بسکٹ اور انڈے کھا کر خانساماں کو رخصت کیا اور عورت سے کہا:۔

" آپ اس کو ایک انڈا اور دو سپون چائے دیجئے"۔

عورت۔ "میرے پاس پیسہ مطلق نہیں"۔

تعلیم یافتہ۔ "افسوس"۔

زاہدہ۔ "آپ نے خانساماں کو اندر بُلا لیا۔ حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ یہاں دو پردہ کرنے والی عورتیں موجود ہیں۔ یہ کمرہ پردہ نشین عورتوں کے واسطے مخصوص ہے۔ آپ کو کوئی حق نہ تھا کہ آپ اس کو اندر بلاتیں"۔

تعلیم یافتہ۔ "آپ بھی مسلمان ہیں۔ اور میں بھی لیکن آپ پُرانی عورتوں کی طرح جاہل ہیں۔ اور اسلام کو مطلق نہیں سمجھتیں۔ میں اسلام کو آپ سے بہتر سمجھتی ہوں۔ پردہ جس قدر ضروری ہے اور جو اسلام کا حکم ہے اس کے خلاف کچھ نہیں ہوا"۔

زاہدہ۔ "ممکن ہے کہ آپ اسلام کو ہم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ مگر آپکو ہمارے جذبات کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ کیا تعلیم کے یہ معنی ہیں کہ دوسروں کے جذبات کا بیدردی سے خون کر دیا جائے"۔

تعلیم یافتہ۔ "آپ نے پردہ کے اصول پر کبھی کبھی توجہ کی۔ یہ آپ کا پردہ پردہ نہیں۔ قید ہے جو شرع اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ مذہب کو سمجھ کر زندہ رہیں۔ ورنہ یہ زندگی فضول ہے۔ اگر آپ زیور تعلیم سے آراستہ ہوتیں۔ اور قوم کا درد آپ کے دل میں ہوتا تو آپ کی زندگی سے مسلمان فائدہ اُٹھاتے۔ جس بُری طرح مردوں نے ہمارے حقوق پامال کئے ہیں اور ہم کو انسان سے حیوان بنا رکھا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہم آخر انسان ہیں اور اپنی ذلت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔

اوہ۔ اوہ کیسی سخت تکلیف اس لڑکے کی کھانسی سے ہوتی ہے۔ باہر جاؤ۔ باہر جاؤ۔ تم لوگ اتنا نہیں سمجھتا کہ دوسروں کو تکلیف دینے کا تم کو

کیا حق ہے۔ اگر تم باہر نہیں جاتیں تو ہم تم کو زبردستی نکال دیگا۔ اور ابھی تمہارا رپورٹ کرتا ہے"۔

عورت۔ "بیوی ذرا باہر نکل کر تو دیکھو ہوا غضب ڈھا رہی ہے۔ اس پھول کو مار دے گی"۔

تعلیم یافتہ۔ "پھول پھول مت بکو۔ یہ تم کو پھول ہے ہم کو نہیں۔ انسان کا بچہ ہے۔ ہونا ہے مرتا ہے۔ دوسروں کو اذیت مت دو۔ چلو۔ نہیں ہم ابھی رپورٹ کرتا ہے"۔

عورت نے بچہ کو سنبھالا اور تعلیم یافتہ بیوی کا منہ تکتی ہوئی باہر آ بیٹھی۔ زاہدہ یہ منظر دیکھ کر لرز گئی اور خود بھی برقع اوڑھ باہر چلی آئی۔ عورت کی حالت نہایت خراب تھی۔ بچہ نے اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کر دی تھی۔ اس کے منہ کو تکتی تھی، پیار کرتی تھی، روتی تھی اور بیتاب ہوتی تھی۔

زاہدہ نے پوچھا:۔

"یہ کب سے بیمار ہے۔ آپ اس کو کیا دوا دے رہی ہیں۔ اور آپ کو جانا کہاں ہے"؟

عورت۔ "بیوی کیا بتاؤں۔ کیوں پوچھتی ہو۔ کیا فائدہ دنیا کے جھگڑے ہیں چل رہے ہیں۔ جب تک زندہ ہوں چلتے رہیں گے"۔

زاہدہ۔ "آخر آپ بتائیے تو سہی بتانے میں کیا نقصان ہے"؟

عورت۔ "میں شاہجہاں پور کی رہنے والی ہوں۔ وہیں بیاہی گئی۔ میرے والد پہاڑ پر نوکر تھے۔ زلزلہ میں ہمارا تمام مکان اور آدمی دب گئے۔ اور میرے سر سے ماں باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا۔ ایک شخص نے جس کا نام بھول گئی ہم کو آ کر اطلاع دی کہ میری اماں جان مرتی دفعہ زیور کسی کے سپرد کر گئی ہیں۔ کسی معتبر آدمی کو

بھیجکر وہ منگوالو۔ کوئی صاحب مدرسہ میں احسان ہیں ان کی بیوی کے پاس
امانت ہے۔ میرے میاں بیمار تھے۔ اور ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ
اتنی دُور کا سفر کرسکیں کہ ان کی بیوی کی اماں کا خط آیا۔ اور ہم پہاڑ روانہ ہوگئے۔
میاں بیمار تھے۔ پہاڑ پہونچکر اور بھی مرض بڑھ گیا۔ اور پانچ روز میں چٹ پٹ
ہوگئے۔

بیوی کس کس کو روؤں ماں باپ کو، شوہر کو! میں اکیلی یا یہ دو برس کا معصوم
پتہ پوچھ پوچھ احسان صاحب کی بیوی کے پاس پہونچی۔ انہوں نے وہ گالیاں
دیں کہ خدا کی پناہ۔ اُن کے ابا مارنے کیلئے دوڑے۔ اور گھر سے نکال دیا۔ سرائے
میں ٹھہری ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے شرارت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ ایک رات
سرائے میں کاٹنی قیامت ہوگئی۔ اسی حالت میں دن نکلتے ہی وہاں سے بھاگی سرائے
والے نے جو اسباب تھا وہ اپنے داموں میں چھین لیا۔ اب میرے پاس سوا اس
لال کے جو میری گود میں ہے۔ یا ان کپڑوں کے جو بدن پر ہیں اور کچھ نہیں
ارادہ ہے کہ پاؤں پاؤں چلی جاؤں۔ بیوی اس بچہ کو کیا پوچھتی ہو بِن باپ کا بچہ
ہے۔ اگر اس کا باپ ہوتا تو وقت مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈھاتا۔ اور میں اس کے
واسطے ایک ایک پیسہ کے شربت کو نہ ترستی۔ یہ بِن باپ کا بچہ ہے وارث
کا ہے۔ جس کو تمہارے سامنے میرے ہی جیسی ایک عورت نے جو خود بھی اولاد والی
ہوگی۔ کھانسنے کے جرم میں مسافر خانہ سے باہر نکال دیا۔ خدا کے واسطے بیوی!
دیکھو تو سہی یہ کیسے سانس لے رہا ہے۔ اسے شکور میری گود پردیس میں خالی
نہ کیجیو! اے چاند آنکھ کھول! ہائے بیوی مُنہ کھولے دیتا ہے للہ اپنے بچوں کا
صدقہ، اپنے ہاتھ پاؤں کا طفیل! میرے کلیجہ کا ٹکڑا صرف اتنی دیر گود میں لے
لو کہ میں بھیک مانگ کر اس کے واسطے تھوڑی سی چا رہے لے آؤں۔ ہائے بیوی

خدا کے واسطے بتاؤ اس کو کیا ہو رہا ہے؟

زاہدہ۔ "آپ گھبرائیے نہیں خدا پر بھروسہ رکھئے وہی فضل کرنے والا ہے۔ بچہ کو آپ شوق سے میری گود میں دیدیجئے۔ آپ کو خود جانے کی ضرورت نہیں میں ابھی چائے منگواتی ہوں"۔

اتنا کہہ کر زاہدہ اٹھی اور احسان سے چائے کی پیالی اور ایک انڈا منگوا کر بچہ کو دیا۔ بچہ اصل میں سردی مان گیا تھا۔ چائے پیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور ماں سے کہنے لگا۔

"بیوی بھوک"

قارون کی دولت، روئے زمین کی سلطنت کوئی چیز ایسی نہ تھی جو بدنصیب ماں کی نگاہ میں ان دو لفظوں سے زیادہ وقعت رکھتی۔ فرطِ محبت میں بیتاب ہو کر چمٹ گئی۔ زاہدہ نے انڈا چھیلا اور بچہ کو دیا۔ اِدھر تو چائے پی۔ اُدھر کھایا انڈا، اِدھر سے زاہدہ نے یہ ہشیاری کی کہ چاروں طرف سے رضائی سمیٹ کر خود ہوا کی طرف بیٹھی اور بچہ کو اچھی طرح دبکایا پسینہ آیا اور اس شدت سے کہ اس جاڑہ میں زاہدہ کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔ اس کی گود اور بچہ کے کپڑے سب جوڑا تھے۔ اب زاہدہ کی جان میں جان آگئی۔ اور عورت سے کہا:۔

"آپ وہ خط مجھ کو دکھا سکتی ہیں۔ جو آپ کے پاس زیور کے سلسلے میں گیا تھا"۔

عورت۔ "جی ہاں یہ اوپر ہی رکھا ہے دیکھئے"۔

زاہدہ نے خط دیکھا تو ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ منت کہا آپ دو تین روز کے واسطے میرے ساتھ تشریف لے چلئے"۔

عورت۔ "بیوی آپ کے احسان کا میں کسی طرح شکریہ ادا نہیں کرسکتی

آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا اس کا اجر آپ کو خدا دیگا۔ میں نے اس سفر میں مسلمان مردوں کا جو تجربہ کیا خدا اس سے سب کو بچائے۔ آپ تو یہ دعا کیجئے کہ میں کسی طرح اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ پھر انشاء اللہ گھر سے باہر قدم نہ رکھوں گی۔ روکھی روٹی اور چنے اچھے۔ اپنا کونہ بھلا اور آپ بھلے"۔

زاہدہ۔ "آپ کا یہ فرمانا نہایت درست ہے۔ مگر آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ میں آپ کو اپنی حقیقی بہن کی طرح رکھوں گی۔ آپ کی عزت' اپنی عزت' اور آپ کی تکلیف میری اپنی تکلیف ہے۔ میں اس کا شاہد خدا کو کرتی ہوں کہ آپ کو دغا نہ دونگی"۔

عورت۔ "خدا سے زیادہ تو کوئی نہیں ہے۔ اور آپ کے احسانات نے مجھ کو واقعی گرویدہ کرلیا ہے۔ اگر آپ یقین دلاتی ہیں تو بہت اچھا۔ مگر میرے پاس کرایہ نہیں ہے"۔

زاہدہ۔ "آپ اس کا خیال نہ کیجئے"۔

عورت۔ "اتنا خیال رکھئے کہ میں ایک بدنصیب عورت ہوں۔ گو میرے سر سے وارث اٹھ گیا اور میں تنہا ہوں۔ مگر آپ کی نیت میں خرابی ہوئی تو میری جان کا اور اس بچے کا عذاب آپ کے سر ہوگا"۔

زاہدہ۔ "آپ کیا فرما رہی ہیں۔ اور کیا سمجھ رہی ہیں۔ آپ مطمئن رہیے۔ آپ کو دھوکا نہ ہوگا"۔

زاہدہ احسان اور عورت تینوں گھر پہنچے۔ عورت نے دروازے میں کھڑے ہو کر پہلے اپنا اطمینان کیا۔ عورتوں کے بولنے کی' لڑکیوں کے کلام اللہ پڑھنے کی آواز سے دل ٹھکانا تو اندر داخل ہوئی اور ایک کونہ میں چپکی بیٹھ گئی۔

زاہدہ نے ماں سے مفصل کیفیت بیان کی تو اس نے زبردستی بلا کر اندر بٹھایا اور بھائی کو جو شاہجہاں پور گئے تھے بلایا۔ انہوں نے بچہ کو پہچانا خط موجود ہی تھا۔

زاہدہ نے چھپکے سے زیور کی پوٹلی نکالی اور سامنے لاکر رکھی۔ عورت کی آنکھ سے خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ اور جب یہ الفاظ سُنے کہ

"بیوی معاف کرنا میں نے اطمینان کی وجہ سے یہ دیر لگائی"۔

تو دوڑ کر لپٹ گئی اور کہا:۔

"میں آپ کے احسان جبتک زندہ ہوں فراموش نہیں کر سکتی"۔

زاہدہ ۔" یہ آپ کا کرم ہے میں نے درحقیقت آپ کو اسی واسطے تکلیف دی تھی۔ کیونکہ اماں جان کا خط میں نے وہیں پہچان لیا تھا۔ اب یہ آپ کا گھر ہے جب تک جی چاہے شوق سے رہیئے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو میں نے ماموں جان کو رضامند کر لیا ہے۔ وہی آپ کے پاس گئے تھے۔ ضعیف العمر آدمی ہیں اطمینان سے پہنچا دیں گے"۔

عورت ۔" ہاں اگر اب گاڑی کا وقت ہو تو مجھے بھجوا دیجئے"۔

زاہدہ ۔" جی ہاں وہ اسی وقت کی گاڑی میں آپ کے پاس گئے تھے میں نے دریافت کیا تھا"۔

عورت ۔" بہت اچھا"۔

زاہدہ نے گاڑی منگوائی۔ جب عورت دروازہ میں پہنچی تو ساجدہ نے آکر مہمان کو گلے لگایا اور کہا:۔

"یہ کھانا رکھ لیجئے رستہ میں کام آئے گا۔ یہ زیور اس بچہ کی تعلیم کیواسطے رکھیئے اور اپنے اخراجات لشتم پشتم پورے کیجئے۔ یہ کچھ روپے ہیں۔ آئندہ پھر پہلی تاریخ کو جو کچھ میں بھیجوں اپنی عنایت سے قبول فرما کر مجھے ممنون فرمایئے"۔

گاڑی موجود تھی۔ عورت اپنے بچہ کو لیکر اندر بیٹھی۔ بڑے میاں باہر اور اس طرح زاہدہ اپنے مہمان کو رخصت کر بار امانت سے سبکدوش ہوئی۔

اکیسواں باب

بے شمار پھول باغوں میں کھلے اور مرجھائے۔ لاتعداد رُوحیں دُنیا میں آئیں اور گئیں۔ آج ان پھولوں کا نشان اور ان زندگیوں کا پتہ دُنیائے حیات میں نہیں۔ پھول مرجھانے کو پیدا ہوئے، اور زندگیاں ناپید ہونے کو آئیں۔ فنا ہونے والے پھول نہیں ہیں۔ ان کا سُراغ نہ لگے۔ مگر ان کی مہکار ابھی ہوا میں موجود ہے اور بلبل کے بسے ہوئے پر ان کی زندگی کا نشان دے رہے ہیں۔ مرنے والوں کی ہڈیاں گلگر خاک ہوگئیں۔ ہوا ان کا غبار تاراج و برباد کر چکی۔ مگر ان کے کارنامے ابھی اس دنیا میں ہیں۔ اور جب تک دیکھنے والی آنکھیں موجود ہیں روشن رہیں گے۔ وقت اسلام کے درخشندہ جوہر خاک میں ملا چکا۔ اور وہ پاک نفوس جو اسلام کا بول بالا کر گئے۔ خود زمین کی تہ میں اور ان کے نام آغوش تاریخ میں بے خبر پڑے سوتے ہیں۔ بسا غنیمت تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کہ مغرب کی خوشنما پری کا حسن صرف مردوں ہی کی آنکھیں مسحّر کر رہا تھا اور اسلام کے سدا بہار پھول گھروں کے چپہ چپہ پر مہک رہے تھے۔ مگر قیامت تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز کہ یہ روشنی داخل ہوئی گھروں کے اندر پہنچی اور مایہ ناز ہستیاں جو عورت کی حیثیت میں مسافر اسلام کے نقش پا کا نشان دے رہی تھیں۔ تتر بتر ہوگئیں۔ لڑکیوں کی تعلیم جدید کا غلغلہ در و دیوار سے بلند اور ترقی قوم کی صدائیں ذرّے ذرّے سے اُونچی ہوئیں۔ کوشش معقول اور صدا مستحسن تھی۔ کاش دائرہ مذہب کے اندر اور اصول اسلام سے وابستہ ہوتی۔ مگر زمانہ کی رفتار خنجر آبدار ہاتھ میں لئے تھی اصول چھان چھان کر اور روایات چھانٹ چھانٹ کر ذبح کیں۔ آبائی جوہر پامال اور ارکان مذہب وبال کر دیئے۔ لڑکیاں آزادی کی ہوا میں ترقی کے نعرے لگاتی مشرق پر لعن طعن کرتی مغربی

میدان میں اُتریں۔ مذہب سے جگمگاتے زیور اتار کر الگ پھینکے۔ اور آج وہ وقت ہے
کہ جن گھروں میں صدائے "اللہ اکبر" کلیجہ دہلا دیتی تھی۔ اور گھر والیوں کے سر مالک
حقیقی کے حضور میں جھک جاتے تھے۔ وہاں مؤذن کی اذان گونجتی ہوئی جاکر اور
موسیقی سے ٹکراتی ہوئی واپس ہوتی ہے۔

زمانہ اس رنگ کو بہت کچھ چمکا دیگا۔ تعلیم جدید کی شیدا ہونگی۔ ہونگی خاک
نہیں۔ مگر سمجھیں گی کہ ہم تعلیم یافتہ اور بڑی بوڑھیاں جاہل مطلق۔ مگر گمان غلط اور
وہم لغو ہوگا۔ اگر ایمان کی روشنی دل میں موجود ہو تو انصاف کی نظریں اونچی کر لو اور
ان صورتوں کو دیکھ لو۔ جو آپ کوئی دم کی مہمان ہیں۔ یہ سماں جلد بہت جلد آنکھ سے
اوجھل اور نظر سے چھپنے والا ہے۔ ترقی کے نعرے لگاتے ہوئے غول سڑکوں پر دکھائی
دیں گے۔ مگر کونوں میں دبکا کر ترقی کی دعائیں مانگنے والیاں زمین کا پیوند ہونگی۔

یہ وقت نہ ہوگا، اور یہ باتیں خواب و خیال ہو جائیں گی۔ مگر وہ دن آئے گا
اور ضرور آئے گا کہ مسلمان جس کو منزل مقصود سمجھ رہے ہیں وہ بیابان قیامت خیز
ہوگا۔ موجودہ تعلیم نسواں اس لئے کہ مذہب کا سامان دگمان تک نہیں وہاں جان جائیگی
آسمان اس وقت بتا دے گا کہ وہ آن بان والیاں جو آج قبرستان کی زینت ہیں۔
لاریب مسلمان تھیں۔ جو جوہر قدامت مٹ چکے اور اب سوا ایک آدھ گھر کے
ان کا نام و نشان تک نہیں۔ مگر وقت آئے گا۔ آئے گا اور ضرور آئے گا کہ دنیائے
اسلام ان واقعات کو آنکھوں پر رکھے گی۔

بے غیرتی کی انتہا اور بے حسی کی حد تھی کہ یہ کچھ ہو گیا۔ مگر نتھا ہی کا بدنصیب
کے کان میں جو شہنشاہیاں تہذیب جدید کی گھس چکی تھیں وہ نہ نکلیں۔ عزت گئی، آبرو
گئی، باپ دادا کا نام ڈوبا۔ بزرگوں کی ناک کٹی۔ اور اگر سچ پوچھو تو صورت دکھانے کے
قابل اور منہ سامنے کرنے کے لائق نہ رہی۔ مگر جو ہونی ہوئی عادتیں چڑھے ہوئے رنگ اور پڑے

ہوئے لپکے کسی طرح نہ چھوٹتے تھے۔ اور نہ چھوٹے۔ سال کے بعد باپ نے یہ سمجھا اور سمجھا
کیا سمجھنا چاہیئے تھا۔ کہ یہ جو کچھ ہے سب حسن کا جیتے جی اس کا۔ مرے بعد اس کا۔
پھر میں نے کیوں چار دن کی زندگی کے لئے بُرائی سر لی۔ بیٹے بہو کو بلا گھر بار چیز بست
علاقہ جائیداد سب سپرد کر دیئے۔ بلانو پہلے ہی لیا تھا۔ مگر پورا قبضہ اب ہوا حسن
ٹھوکر کھا چکا تھا۔ اور ایسی کہ پہلے ہی حملے میں تارے دکھائی دے گئے۔ مگر مغربی
تہذیب کی دلدادہ تعلیم یافتہ بیگم کے بھانویں بھی نہ تھا۔ روپے کی ریل پیل ہوتے ہی
وہی بیوی تھیں۔ اور وہی کلب کے جلسے' آزادانہ تفریح' اور روزانہ سیر۔ بیوی کا
واقعہ حسن کو راہ راست پر لے آیا۔ اور نخوت و تمکنت سب رفو چکر ہوئی۔ خدا کے سامنے
سر بھی جھکنے لگا' اور زبان بھی۔ جو شخص مسلمان سے سیدھے منہ بات کرنا کسر شان
سمجھتا تھا وہ کڑکڑاتے جاڑوں میں صبح کی نماز مفلسوں اور غریبوں کے برابر کھڑے ہو کر
جماعت سے پڑھتا۔ اب البتہ میاں بیوی کے مزاج میں زبردست اختلاف کی بنیاد
پڑی۔ میاں مغرب کا دشمن' اسلام کا شیدا' جدت سے نفرت' شہرت سے وحشت!
بیوی ترقی کی عاشق' مذہب سے دور' نام کی غلام' کام کی دشمن! حسن کو ذلت نے
ٹھیک بنایا۔ اور حسن کا رنگ دیکھ کچھ تو صحبت کا اثر' اور کچھ دکھائی دی موت۔ باپ
بھی اسی طرف ڈھلا۔ اب گھر بھر میں ترقی کی حافظ اگر تھیں تو بی شاہدہ۔

گلابی جاڑے تھے۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوا۔ شاہدہ کا لڑکا اسوقت
خاصا ماشاء اللہ دس سال کا تھا۔ اور گو ماں کی صحبت نے بھی اور تربیت نے
بھی اس کا ناس کرنے میں کمی نہ کی تھی۔ مگر باپ کی احتیاط اور احتیاط کیسا تدکو شش
نے اس کو تھوڑا بہت مسلمان بنا دیا تھا۔ روزہ کی خبر شاہدہ کا بہت زور سے سن رہی
تھی۔ اور ہنس رہی تھی۔ تیرہواں روزہ تھا کہ حسن نے ساس کو بلایا۔ اور اس کے
سامنے بیوی سے کہا:۔

"کل منجھلا روزہ ہے۔ بچہ کو روزہ رکھوادو۔ آخر یہ بھی ہم پر فرض ہے۔ اس کو پُورا کرنا ضروری ہے"۔

شاہدہ۔ "فرض کی خوب کہی۔ اس کا روزہ ہم پر فرض۔ یہ اس سے بھی تیز رہی۔ تعجب تم پر ہے کہ ایکا ایکی یہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا کہ ان ڈھکوسلوں کا کلمہ پڑھنے لگے۔ روزہ کی ضرورت اسلام کے ابتدائی دور میں بیشک تھی۔ اس لئے کہ مسلمان یوں بھی فاقہ مرتے تھے۔ روزہ کے لالچ نے ان کو ثواب عاقبت کی تقویت دیدی۔ مگر اب روزہ کو ضروری سمجھنا میری رائے میں غلطی ہے۔ جو کچھ مُلّا نے کہتے ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان فاقہ کی تکلیف محسوس کر سکے۔ چنانچہ ہر شخص کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح ایک آدھ وقت کا فاقہ کر لیتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آدمی فاقہ کی اذیّت محسوس کرنے کے بعد اپنا مال فاتہ کرنے والوں کے حوالے کر دے۔ میں یقیناً اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ میرا بچہ محض تمہاری عقلمندی سے مصیبت بھگتے۔ علاوہ ازیں یہ روزہ کی شادی کیسی کہ تم مہمان جمع کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ بہت سے کام ہیں جہاں روپیہ مناسب طور پر صرف ہو سکتا ہے۔ روپیہ اس واسطے نہیں ہے کہ اُلٹے آکر مرے اُڑائیں اور میرا بچہ روزہ کی مصیبت بھگتے"۔

حسن۔ "کس قدر افسوس ہے تمہاری عقل پر کہ تم نے بالکل ہی مذہب کو کھو دیا۔ اور ایسے ایسے سخت کلمے تمہاری زبان سے نکلتے ہیں۔ تم اگر اپنے تئیں مسلمان کہتی ہو تو تم کو شرم آنی چاہیئے کہ تم اسلام کی اس طرح اپنے منہ سے توہین کرو"۔

شاہدہ۔ "میں بیشک مسلمان ہوں۔ اور تم سے بہتر۔ فرق اتنا ہے تم نے اسلام کو نہیں سمجھا میں نے سمجھ لیا"۔

حسن۔ "اگر تعلیم کا یہی منشا ہے کہ آدمی مذہب چھوڑ دے تو میں کہتا ہوں تعلیم گناہ سخت گناہ"۔

شاہدہ ۔ "اگر مذہب کے یہی معنی ہیں جو تم سمجھ رہے ہو تو تم کو تمہارے مذہب کو، تمہارے خدا کو سب کو سلام" ۔

حسن ۔ "اس قسم کی لغو باتیں تم کو ایک دفعہ پورا مزہ چکھا چکی ہیں ۔ اور ابھی تک نافرمانی اور خود رائی کی گفتگو کرتی ہو ۔ تم کو جو سزا ملی وہ خدا کا غضب تھا جو تمہارے اوپر ٹوٹا" ۔

شاہدہ ۔ "مگر تم نے کیا قصور کیا تھا" ؟

حسن ۔ "چنے کے ساتھ گھن پس گیا ۔ تمہاری وجہ سے میں بھی لپیٹ میں آیا" ۔

شاہدہ ۔ "اور تمہاری ماں کی موت کون سے خدا کا عذاب تھا" ؟

حسن ۔ "وہ تو وقت سے مریں، اپنی عمر سے مریں، اپنے ٹھکانے پر مریں" ۔

شاہدہ ۔ "مگر جاہل عورتوں کی عمر تو زیادہ ہوتی ہے ۔ ان کی عمر ایسی تو نہ تھی" ۔

حسن نے بیوی کے اس فقرے کا کچھ جواب نہ دیا ۔ مگر اس کی طبیعت بگڑ گئی ۔ اس کو مری ہوئی ماں کے متعلق یہ الفاظ بہت ناگوار ہوئے ۔ دو تین لمحہ خاموشی رہی ۔ اس کے بعد شاہدہ نے کہا :۔

"اگر روزہ ضروری ہے تو یہ شادی کیا معنی رکھتی ہے ۔ روپیہ صرف کرنا کوئی قومی ضرورت نہیں ہے ۔ ہم جو دن رات ان رسموں کو پیٹ رہے ہیں تو اسی واسطے کہ مسلمان تباہ و برباد ہو چکے ۔ اب ان کے پاس کچھ نہیں ۔ ہاں یہ رسمیں باقی رہ گئیں جو ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی ہیں ۔ اور جہالت کے کھلے ہوئے کرشمے ہیں ۔ کون ایسا آنکھوں کا اندھا ہوگا جو اتنی بات نہ سمجھ سکے کہ جس قوم میں افلاس کی چاروں طرف پکار ہو رہی ہو ۔ وہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ روزہ کی شادی پر اٹھا دے ۔ مدرسے ہیں، یتیم خانے ہیں، انجمنیں ہیں، ان کو دو تو قوم کو کچھ فائدہ پہنچے ۔ مسلمان مصیبتوں سے رہائی پائیں ۔ نہ کہ یہ غضب کہ روزہ کی شادی ہو ۔ مہمان کھانے پینے آ کر جمع ہوں ۔ کوئی

پر پانی مانگے اور کوئی تنبیہ نہ کرے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور اسکی باز پرس خدا کے
ہاں نہ ہوگی۔ یہ اماں جان برابر بیٹھی ہیں۔ اور خدا اور رسولؐ کو جانتی اور پہچانتی ہیں۔ خدا کے واسطے
ذرا مجھ کو جواب دیں۔ یہ بتائیں تم بتاؤ۔ ماشاء اللہ دونوں ایک سے ایک افضل ہیں۔ کوئی
تو اس عقدے کو حل کر دے۔ یہ شادی اچھی یا قوم کی بربادی کا خیال اچھا؟

ماں ۔" تمہارا خیال بظاہر درست، اور تمہاری رائے دیکھنے کو معقول اور
ماننے کو نہایت اچھی ہے۔ اور ہم بھی اس رائے کی تائید اور اس خیال کی درستی
سے متفق ہیں۔ بیشک ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر تمہارے خیال میں کچھ بحث کی ضرورت
اور تھوڑے اختلاف کی حاجت ہے۔ بشرطیکہ ناگوار نہ ہو، اور برا نہ مانو۔

ہم کو تم سے اس معاملہ میں اتفاق ہے کہ ان رسوم نے جو دوسروں
سے لی گئیں **یقیناً** مسلمانوں کو تباہ کیا۔ بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ
عام طور پر مسلمانوں کا بڑا حصہ رسوم کی بدولت پریشان ہوا۔ مگر اس سلسلہ میں سب سے پہلے
رسم کی نوعیت اور ادا کرنے والے کی حالت پر غور کرنا ہوگا۔ رسم مفلس کے واسطے زحمت
اور مالدار کے لئے رحمت ثابت ہوگی۔ بشرطیکہ اعتدال سے آگے نہ بڑھے۔ انجمنوں
یتیموں، غریبوں، اپاہجوں کی خدمت سے کس کو انکار ہے۔ مگر سب سے پہلا حق تو تمہارے
اوپر تمہارے عزیزوں کا ہے۔ وہ عزیز جن کو روٹی کپڑا کچھ بھی میسر نہیں۔ تمہارے
میکے اور سسرال میں کیسی کیسی دکھیاری رانڈیں، کیسے کیسے یتیم معصوم بکھرے پڑے
ہیں۔ کیا تم کہہ سکتی ہو، تمہارے میاں بتا سکتے ہیں کہ رمضان بھر میں کتنی مرتبہ
اپنے دسترخوان سے اٹھا کر دو روٹیاں ان کو بھیجدیں؟ جوان لڑکیاں معذور بڈھے
غریب بچے فاقوں سے سوتیں، اور ننگے پھرتیں۔ کیا تمہارا دل بدنصیبوں کی مصیبت
پر پسیجا؟ اور حاجتمندوں کی حاجت پر کڑھا؟ بیوہ بیچاری نصیبا ڈیڑھ سال کی
بیاہی رانڈ بیٹھی ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے رنڈاپا کاٹ دیا اور ان میں فرق نہ آیا۔

تمہارے میاں کی حقیقی خالہ زاد بہن ہے ۔ مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارے ٹکڑے کی
شرمندہ نہیں ۔ یہ رسم درحقیقت رسم نہیں ہے ۔ ایک بہانہ ہے کہ تمام عزیز اقارب
ایک جگہ جمع ہو کر ایک گھر میں بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھالیں ۔ اور اس سلسلے
میں امیر کے پیسے سے غریب بھی مستفیض ہو جائے ۔ کیسی شادی اور کیسا چلہ
معبود حقیقی کا شکریہ کہ تو نے اس بچے کو اس قابل کیا کہ ہماری زندگی میں یہ تیرے
حکم کی تعمیل کرتا ہے ۔ اس مسرت میں جو تو نے ہم کو عنایت کی ۔ ہم تیرا شکریہ اس
طرح ادا کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کو جو تیرا حکم ہے ۔ تیرے حاجتمند بندوں کو جو تیرا
ارشاد ہے کھانا کھلا کر خوشی کرتے ہیں ۔ تاکہ ان کے دُکھے ہوئے دل تسکین پا کر دعا
کریں ۔ تو قبول کرے اور ہمارے بچہ کی عمر میں ترقی ہو ۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ
ضرورت کے موقعہ پر دو ۔ بیٹی کو کوئی خواہ مخواہ نہیں دیا کرتا ۔ دیتے وہاں ہیں جہاں
اپنا کام ہو یا نام ۔ وہ دینے والے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو ۔ قبروں
میں جا سوئے ۔ اب اگر ایسے موجود ہیں تو وہ دیں شوق سے دیں اس سے بہتر
کام اور کیا ہوگا ۔ مگر اس لئے کہ بیٹے کے روزہ کی شادی ہے ہر شخص اس ماحول میں
ہر شخص خوشی خوشی روپیہ صرف کر دے گا ۔

اسی واسطے یہ سلسلے بڑوں نے مقرر کر دیئے ۔ اور وہ بھی ان لوگوں کے
واسطے جن کے پاس ہے ۔ ان کے لئے نہیں کہ گھر میں نہیں کوڑی کفن کو ٹکے والے ہوت
قرض لیا نام کیا ۔ بھیک مانگی گروی رکھا اور شادی رچا بیٹھے ۔ ان کے واسطے تو
یہ ثواب سخت عذاب ہے ۔ وہ رسوم جن میں ذوی القربیٰ کی تعمیل ہو ہمارا ایمان ۔
وہ رسمیں جن میں غربا امیروں سے مستفید ہوں لاریب جائز ۔ وہ رسمیں جو ہماری
روایات کو زندہ رکھیں ، بلاشک درست ، خدا نے اپنے فضل و کرم سے تم کو دیا ہے
اور ضرورت سے زیادہ ۔ یہ صرف تمہاری ملکیت نہیں ۔ تم لاکھ اپنا مال اور ہزار اپنی

چیز سمجھو۔ مگر اس میں دوسروں کے بھی حقوق اور سب سے بڑا حق، سب سے بڑا حصہ، اسی دینے والے کا ہے جو دینے کی قدرت رکھ کر، لینے کی طاقت رکھ کر، یتیم کی صورت میں، فقیر کی ہیئت میں تمہارے دروازے پر آئے، تمہارے پڑوس میں رہے۔ تمہارے محلہ میں رہے، تمہاری دنیا میں بسے۔ کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے اپنی تمام عمر میں کبھی بھی اس نیت سے، اس خیال سے، اس ارادے سے کسی حاجتمند کی ضرورت، کسی بدنصیب کی مصیبت، کسی دکھیاری کا دکھ، دور کیا، پورا کیا، رفع کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، کبھی نہیں، قطعی نہیں! پھر تم ہی بتاؤ کہ اگر اسی بہانے دولت نیک لگی، تمہارا بیڑا پار ہوا، تمہاری عاقبت سنور گئی تو اچھا ہوا یا برا؟ میں ان لوگوں کی دشمن ہوں جو خود کسی قابل نہیں۔ مگر مصیبت میں پھنس کر، آفت میں گھر کر، قرض لیکر رسمیں ادا کریں۔ اور اسی طرح ان لوگوں کی بھی جو مالدار ہوکر، دولتمند بنکر، روپیہ رکھکر، ضروری رسم سے بچیں اور روٹی کا ایک ٹکڑا، روپیہ کا ایک پیسہ، نقصان کا ایک چیتھڑا، خدا کی راہ پر نہ دیں۔ تمہارے یہ دونوں بچے کئی سال سے تمہاری غلامی کر رہے ہیں۔ یہ آج بن ماں کے سہی، بن باپ کے سہی۔ مگر کبھی کلیجہ کے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھے۔ اسوقت وہ آنکھیں بند اور وہ کلیجے موجود نہ ہوں۔ مگر یہ مسلمانوں کی اولاد میں۔ تم بتا سکتی ہو کہ اس عرصہ میں تم نے کتنی مرتبہ انکو کلیجے سے لگایا اور کے دفعہ گھڑکا جھڑکا۔ ڈانٹا پیٹا۔ کیا یہ صرف اسی لئے پیدا ہوئے تھے کہ ماں کی محبت اور باپ کی شفقت سے محروم ہوکر در در کی ٹھوکریں کھائیں؟ کیا انکی عمر اس قابل نہ تھی کہ تم ان کو تعلیم دیتیں۔ اور یہ پڑھ لکھکر کسی قابل ہوتے؟ ان کی صورت اگر آنکھیں ہوں، ان کی حالت اگر کان ہوں، کچھ دکھاتی ہے، کچھ سناتی ہے، عقل ہو تو کچھ بتاتی ہے۔ اور ایمان ہو تو کچھ طلب کرتی ہے۔ یہ تمہارے کلمہ کے شریک، تمہارے مذہب کے ساتھی، اور تمہاری قوم کے بچے ہیں۔ جو روکھے ٹکڑے کھا کر اور چیتھڑے پہن کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

انہوں نے زبان سے نہیں، اپنی حرکات سے، انہوں نے منہ سے نہیں اشارات سے، اپنی کتھا تم کو سنائی، اپنی مصیبت تم کو بتائی، مگر تمہارا دل نہ پسیجا، لیکن اس روزہ کے طفیل تمہارے بچہ کی بدولت اور اس رسم کے صدقہ میں ان کا تن ڈھکے گا اور ان کا پیٹ بھرے گا۔

حسن میاں بچہ کو روزہ رکھواؤ۔ اور گڑگڑا کر معبود حقیقی سے التجا کرو کہ وہ اس کی بہار تم کو دیکھنی نصیب کرے۔ اس کی عمر میں برکت دے اور اس کا صدمہ تم کو نہ دکھائے۔ محتاجوں کو کپڑے پہناؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ روؤ اور گڑگڑاؤ کہ اے حاکم حقیقی میری التجا سن۔ اور جو بچہ آج روزے کا دولہا ہے۔ اس کو دلہن کا دولہا بننا نصیب ہو"۔

بائیسواں باب

شوہر کی بیکاری کا زاھدہ کے دل پر ایسا کاری زخم اور گہرا صدمہ تھا کہ گو باپ کی طرف سے کم اور ماں کی طرف سے کافی۔ ساس کی طرف سے تھوڑی اور خسر کی طرف سے معقول مدد اس کو مل رہی تھی۔ مگر وہ رعایت مصیبت اور سلوک عذاب سمجھتی تھی۔ مجبور لیتی، اور لاچار صرف کرتی۔ مگر دو چار دفعہ نہیں بیسیوں مرتبہ اس نے بارہا کہا کہ "میاں کی کمائی کا ایک پیسہ اس ڈھیر سے اور سوکھی روٹی اس قورمہ سے افضل اور بہتر"۔ بیوی کا خیال کسی نہ کسی ذریعہ سے میاں کے کان تک پہنچا اور یہ کچھ نہیں کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوتا۔ اس کی خود رائے یہ ہی تھی۔ اور اچھی طرح سمجھتا کہ بڈھے باپ اور امیر خسر کی کمائی میں خواہ مخواہ ساجھا لڑانا انتہائے بےحمیتی ہے۔ مگر کرتا کیا؟ دن دن بھر مارا مارا پھرا، راتوں بھر نمازیں پڑھیں، مگر روزگار نہ ملا، احسان کی وہ شان اور طمطراق سب پہاڑ ہی تک تھی۔ گھر آکر ادھر تو روپیہ کا ٹوٹا، ادھر دوستوں

سے کچوکے، اور سب سے بڑی مصیبت پریشانی، غرض وہ صاحبیت تو پہاڑ سے چلتے ہی چلتے کم ہوگئی رستے میں اور کچھ جھوجھری ہوئی۔ اور گھر پہنچکر تو وہی کورا احسان تھا۔ مصیبت وہ اکسیر ہے کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں مروڑ کر نیچے جھکا دیں۔ احسان تو کس گنتی میں تھا دو چار دن تو ذرا اکڑا رہا۔ مگر پھر جو جھکا تو یہ حال تھا کہ کسی وقت کی نماز ناغہ نہ کرتا۔ زاھدہ پہلے ہی وظیفہ اور تسبیح کی اتنی دلدادہ تھی کہ بچپن ہی میں کنبہ بھر جحن جحن کہتا تھا۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ حصن حصین کا ختم یا غفور کی تسبیح یا کریم کا وظیفہ دن رات تھا۔ بہر حال میاں بیوی کی التجا کا اثر تھا یا صرف میاں کی کوشش کا نتیجہ۔ احسان کو ایک جگہ ملی اور اچھی ملی۔ ہم اس موقعہ پر زاھدہ کی تعریف جس قدر کریں وہ کم۔ اس نے پہلی تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی غربا کو کھانا کھلایا اور تمام عزیز اقارب کو جمع کیا، مولود شریف پڑھا۔ اس سلسلہ میں وہ دونوں پھوپھی بھتیجیاں رحیمن اور منیرن جو زاھدہ کے ہاتھوں حوالات میں پہنچی تھیں جس وقت آئی ہیں اور زاھدہ مہمانوں کو چھوڑ اٹھی رحیمن کو لینے گئی ہے تو ہر شخص اس کا مداح تھا۔

ذکر ولادت کے بعد زاھدہ نے یہ تقریر کی :۔

"بزرگ ماؤں اور عزیز بہنو! آپ نے حضور اکرمؐ کے حالات سُن لئے اور دیکھ لیا کہ وہ ذات پاک جو غریبوں کا ملجا اور یتیموں کا ماویٰ ہے کس طرح دُنیا میں رہی۔ اور کیونکر یہاں سے رخصت ہوئی۔ اس پاک زندگی کا ہر واقعہ اور واقعات کا ہر حصہ ہم کو اسلام کے معنی بتا رہا ہے۔ سرورِ عالمؐ کے بعد خلفائے راشدین کا دور ہم سے با آوازِ بلند کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے شمشیر نہیں کو ساتھ لیکر دُنیا میں ترقی کی۔ تاریخ سے بڑا شاہد کون ہوگا جس نے ہم کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسلام کی منحوس گھڑی وہ تھی جب

مسلمان مذہب سے علیحدہ ہوئے مصیبت کی گھٹائیں اسی وقت سر وں پر چھا گئیں۔ افلاس کے پنجے اسی حالت میں تیز اور دقت کے پہاڑ اسی وقت چاروں طرف سے نمودار ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہم جو علوم و فنون میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ جاہل مطلق بن گئے۔ خدا غریق رحمت کرے سرسید کو کہ انہوں نے بد نصیب قوم کی جو عرصہ حیات میں دم توڑ رہی تھی نبض دیکھی۔ اور مرض پہچانا، نسخہ لکھا، اور دوا دی۔ ہم اپنے عروج کو تو کیا پہنچتے مگر خیر نا سے ہاں ہو گئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس جدوجہد کا نتیجہ حسب توقع خوشگوار نہ نکلا اور اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ مذہب کا لحاظ کامل طور پر کیا گیا۔ وہ تجویزیں ختم، وہ کوششیں پوری، اور وہ منصوبے مکمل ہو چکے۔ اور جن دماغوں میں عقل جن آنکھوں میں روشنی اور جن دلوں میں ایمان موجود ہے ان کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اندھی تقلید اور دوری مذہب نے جو بربادی کا پیش خیمہ تھی ستیاناس کر دیا۔ اب ہمارے سامنے تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مسلمان اس کی اہمیت کو سمجھ گئے غلط ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں کہ مسلمانوں پر یہ حکم ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ مسلمانوں نے تعلیم کے متعلق حضور اکرمؐ کے ارشاد کو ہمیشہ سر آنکھوں پر رکھا۔ مگر انہوں نے اس تعلیم کو جو آجکل دی جا رہی ہے تعلیم نہ سمجھا انہوں نے یہ جائز خیال نہ کیا کہ اپنی لڑکیوں کو جن کے جوہر عصمت کے معاملہ میں وہ دنیا کی ہر شے کو ہیچ سمجھتے تھے اپنی آنکھ سے ایک لمحہ بھر کے لئے اوجھل کر دیں آج کی دنیا اس کو غلط کہدے مگر خیال

یقینی معقول اور فیصلہ بلا شک صحیح تھا۔ وقت نے ان کو عاجز اور ضرورت نے ان کو لاچار، اور زمانہ نے ان کو مجبور کیا۔ دولت ان سے گئی، حکومت ان سے چھٹی، سلطنت ان سے گئی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اگر ان کو دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ تو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے کونوں میں دبک کر اپنے کھنڈروں میں سکڑ کر اپنی آبرو کو دونوں ہاتھوں سے بنائیں، بڑوں کی عزت کو کلیجہ سے لگائے خاموش بیٹھیں، اور اپنا بھرم رکھیں دولت نہ تھی، عزت تھی، راج نہ تھا، لاج تھی۔ حکومت نہ تھی، غیرت تھی۔ مر گئے۔ مگر بات نہ بگڑنے دی۔ دولت مند بہنو! ان کو اپنے نقطۂ نظر سے نہ دیکھو۔ تم آٹھ سیر کے آٹے، اور آدھ سیر کے گھی میں مگن ہو وہ غریب ۲۰ سیر کے آٹے اور ڈیڑھ سیر کے گھی میں بھی مشکل سے پیٹ بھرتے تھے۔ تم پر صرف اپنی ذات کے حقوق ہیں۔ اُن بدنصیبوں پر غیروں کے بھی تھے تم کھا کر مطمئن اور پہن کر خوش ہوتی ہو تو وہ کھلا کر خوش اور پہنا کر بشاش ہوتے تھے۔ میں ایسی خوش نصیب نہیں ہوں کہ وہ صورتیں اپنی آنکھ سے دیکھتی۔ مگر ان کے جوہر سُنے ہیں۔ اور ان کے کھنڈر دیکھنے کو ترستی ہوں۔ کیا تم اس سفید ڈاڑھی کو قابل رحم اور اس پیشانی کو جو گھنٹوں سجدے میں رہی ہو لائق ہمدردی نہیں سمجھتیں جس کا منظر میں تم کو دکھاتی ہوں۔

نماز مغرب سے فراغت پا کر بڑے میاں لکڑی ٹیکتے ہوئے بیوہ پڑوسن کے گھر پہنچے اور پوچھا:۔

"بیٹی تیل منگوا لیا"؟

بیوہ ۔ "جی نہیں آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ننھا بھی بخار میں لوٹھ ہے۔ دھیلے کا تیل، اور دھیلے کا شربت بنفشہ لا دیجئے"۔

ایک ہاتھ میں ٹوٹی بوتل، دوسرے میں پچپکا کٹورا۔ تیل لائے، شربت لائے۔ بیوہ نے کہا:۔

"اے ہے نانا میں تو بھول گئی ایک پیسہ کے اُوپلے بھی لا دیجئے"۔

بڑے میاں ۔ "اچھا بٹیا لاؤ"۔

رات کا وقت، سڑک پر اندھیرا، بغل میں بوجھ۔ ٹھوکر کھائی گرے اور اُٹھے، چاروں طرف ٹٹول کر اُوپلے سمیٹے۔ ایمان زبان سے کہتے ہوئے لرزتا ہے۔ اور تمہارے نازک دل یہ سُنکر کانپ جائیں گے کہ بڑے میاں نے اس اندھیرے میں اس خیال سے کہ بیوہ کے مال کا قیامت کے روز مجھ سے مواخذہ نہ ہو۔ ایک ایک کُرسی ڈھونڈ ڈھونڈ کر چُنی، اور لے کر آئے تو بیوہ نے اُوپلے لیکر کہا "مکان دار آیا تھا۔ کرایہ کا روپیہ میرے پاس کہاں۔ میں نے اسوقت بات نہیں کی۔ یہ دینے چاہئیے"۔

بڑے میاں ۔ "تم نے بہت اچھا کیا۔ لاؤ میں دیدوں گا بھلا عورت کا غیر مرد سے بات کرنا کیسا۔ بیٹی ہم نے ایک دفعہ مولانا سے یہ سُنا تھا کہ کسی موقعہ پر حضرت ابو بکرؓ اور بی بی عائشہؓ دونوں باپ بیٹیاں باتیں کر رہے تھے۔ کہ رسول اللہؐ تشریف لے آئے۔ اور آپ نے اس تنہائی کو پسند نہ فرمایا۔ بھلا خیال تو کرو صدیقؓ جیسا باپ اور صدیقہؓ جیسی بیٹی کہ بیٹی بھی، اور مسلمانوں کی ماں بھی۔ جب یہ صورت ہو تو ہم جیسے گنہگار کس گنتی میں۔ بیٹی جہاں دو آدمی ہوتے ہیں وہاں تیسرا شیطان ضرور ہوتا ہے۔ اور تمہارے حالات کا

تقاضا یہی تھا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اُس سے بات نہ کی اس کونہ
میں بیٹھی اللہ اللہ کرتی رہو۔ خدا عزت آبرو سے اٹھا لے تو سب کچھ بھر پایا“۔
میری بہنو! میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ وقت تمہارے
ساتھ ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو گی وہ صحیح۔ اور میں جو کچھ بھی کروں گی وہ غلط۔
مگر تمہارے ایمان پر فیصلہ چھوڑتی ہوں۔ کیا بڑے میاں کی یہ رائے
غلط تھی کہ **عورت کی عصمت پر تمام خاندان کی عزت
کا انحصار ہے**۔ اگر نہیں تھی اور ان کا خیال درست تھا تو کیا وہ یہ
کر سکتے تھے کہ اپنی جوان بیٹیوں کو کسی ضرورت سے بھی آنکھ سے دور کر دیں۔

تمہارا دعویٰ اب شاید اور بھی مضبوط ہو جائے۔ اور تم کہہ سکو کہ
عصمت لٹتی تھوڑی پھر رہی ---- کیا ڈاکے پڑ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو
قید کر دو۔ بہنو! تم اس کو قید نہ کہو۔ یہ صرف احتیاط تھی۔ اپنے واسطے
نہیں لڑکیوں کے واسطے کہ وہ ہر بلا سے محفوظ اور ہر آفت سے بچی رہیں۔
میں خود کہتی ہوں کہ ڈاکہ نہیں پڑ رہا۔ اور خدانخواستہ تم سے بھی بدظنی کی
کوئی وجہ نہیں ظَنُّوا الْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا میرا ایمان ہے۔ لیکن امکان
پر غور کرو آخر پچھلے ہی مہینہ کا واقعہ مثن کا لے لو۔ کس طرح ماں
باپ چیختے اور پیٹتے پھرے۔ بڈھے باپ نے کیا کیا نہ کیا اور اس
بڑھاپے نے اس کو کیا کیا نہ دکھایا۔ بھوٹی آنکھ کا دیدہ، عمر بھر کی کمائی
ایک بچی اور وہ آنکھوں کے سامنے غیروں کے پھندے میں پھنس جائے
بدنصیب باپ پر کیا گذری وہی بتا سکتا ہے۔ بیسوں کے آگے ہاتھ
اس نے جوڑے۔ عدالت کے پاؤں میں سر اُس نے رکھا۔ بیٹی کی
منت خوشامد اس نے کی۔ مگر خاک اثر نہ ہوا۔ جوان تھی کھلم کھلا بیساں کی

ہوتی۔ اور وہی نتھو چمار جس کو سارا محلہ جانتا تھا عیسائی ہو کر اس کا شوہر بنا۔ قاضی اور مُلا کچہری اور عدالت کوئی بھی کچھ نہ کر سکا کہ لڑکی اپنی مرضی کی مختار ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ اگر ماں باپ مشن میں آزادانہ نہ بھیجتے تو یہ دن بیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔ اس سے تمہیں انکار نہیں اور ہو سکتا بھی نہیں کہ مشن سکولوں کی تعلیم میں اندیشے کا امکان ہے۔ ایسی حالت میں وہ لوگ بدقسمتی سے چونکہ عصمت کو عورت کا سب سے بڑا جوہر سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے موجودہ ذرائع تعلیم قابل اطمینان نہ سمجھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکالا گیا کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ بلکہ اصلیت وہ احتیاط ہے جو میں نے بیان کی۔ اب تم کو پھر ایک بات کہنے کا موقعہ ملتا ہے کہ حصول علم اسلام کا مسلمہ فیصلہ ہے۔ جس میں مرد کی تخصیص نہ عورت کی اُنہوں نے محض اپنے وہم پر عورت کی تمام زندگی قربان کر دی۔ اور اس کو جاہل رکھ کر قوم کو وہ نقصان پہونچایا۔ جس کی تلافی صدیاں بھی مشکل سے کریں گی۔

مجھے اعتراض کے پہلے حصے سے اتفاق ہے۔ اور میں اعتراف کرتی ہوں کہ تحصیل علم کی کوشش اسلام کا فیصلہ قطعی ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ اتنا ضرور کہوں گی کہ اسی وقت تک اسی حال میں اور اسی صورت میں کہ ہمارے مذہب پر آنچ نہ آئے۔ جب ہمارے مذہب پر نوبت آئی تو ہم وہ لوگ ہیں کہ علم کیا تو بہ توبہ نعوذ باللہ.....

خیر میں کچھ اور تو نہیں کہتی۔ اپنی زندگیوں تک کو قربان کر دیں۔ مسلمانوں نے اگر تعلیم نسواں کو مذہب پر قربان کیا تو کیا گناہ کیا۔ وہ

دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کے اتنے مدرسے موجود نہیں، اتنی اُستانیاں میسّر نہیں، اتنے انتظام ممکن نہیں، وہ سُنتے تھے کہ مشن کی پڑھنے والیاں اذان کے وقت انجیل کے سبق رٹ رہی ہیں۔ وہ دیکھتے تھے، اور سُنتے تھے، وہ جانتے تھے ان کو معلوم تھا کہ مؤذن کے الفاظ ہَوا میں گونج رہے ہیں۔ اور نیند کے متوالوں کو جگا جگا کر حق کی طرف بُلا رہے ہیں، مگر کواری بچیاں جوان اور ہوشیار تکیہ کے نیچے سے انجیل نکال کر چھپا چھپا حفظ کر رہی ہیں۔

وہ جانتے تھے کہ یہ ان مرنے والوں کی بچیاں ہیں جن کے کلیجے پیغام حق دہلا دیتا تھا کلمہ پڑھ کر اُٹھ بیٹھتی تھیں۔ اور کڑکڑاتے جاڑوں میں وضو کر کے سجدوں میں گڑگڑا گڑگڑا کر احکم الحاکمین کی وحدانیت کا اعتراف کرتی تھیں۔

میری بچیو! کواری بیٹی کو دُلہن بنا کر پالکی میں بٹھا دو۔ وداع کر دو میّت کو نہلا دھلا چارپائی پر لٹا کر رخصت کر دو۔ مگر وداع مذہب آسان کام نہیں۔ جو لوگ اس کو جُدا کر رہے ہیں۔ ان کو معلوم نہ ہو۔ مگر ان کی حالت پر ابھی رونے والی آنکھیں دنیا میں موجود ہیں۔ یہ دو چیزیں عصمت اور مذہب مسلمانوں کے سامنے تھیں۔ اور ہیں۔ ترازو کا ایک پلڑا یہ تھا اور دوسرا تعلیم نسواں۔ واقعات تمہارے سامنے ہیں۔ ترازو اپنے ہاتھ میں ہے۔ لو اور بتا دو کہ کدھر کا پلڑا وزنی ہے۔ اور بڑے میاں کیا کریں۔

یہ میں نے منوا دیا۔ مگر واقعہ جو تم سمجھ رہی ہو وہ نہیں انہوں نے

تعلیم نسواں کو ہرگز نہیں چھوڑا۔ وہ صرف اسی تعلیم کے مخالف تھے
جو ان کے اصولوں سے علیحدہ تھی۔ وہ پڑھاتے تھے لکھاتے تھے
اور بتاتے تھے کہ دنیا میں کیونکر رہنا اور کیا کرنا ہے۔ میری بہنو!
ان کا ہر گھر مکتب اور ہر محلہ مدرسہ تھا۔ یہ مبالغہ نہیں ہر پڑھی لکھی عورت
کا فرض تھا کہ محلہ کے بچوں کو پڑھائے۔ اب وہ سماں نہ رہا۔ مگر اسکے
دیکھنے والے موجود ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بغل میں تکیہ اور پارے
لئے علی الصبح استانی کے یہاں پہنچ گئیں۔ یہ اپنا ہی محلہ اور دیوار
بیچ گھر ہے۔ مائیں آ اور جا رہی ہیں، دیکھ اور بھال رہی ہیں کہ تعلیم
کیوں کر ہو رہی ہے۔ پڑھنا، لکھنا، سینا پرونا، کھانا پکانا جو آج میسر
نہیں آسکتا وہاں باتوں باتوں میں حاصل ہوتا تھا۔ تم مشکل سے اور
شاید دس پانچ منٹ میں کاغذ اور قلم پنسل اور سلیٹ پر لکھ کر بتاؤ گی
مگر وہ تمہارے سامنے زبانی حساب کر کے بتا دیں گی کہ دو روپے ساڑھے
چھ آنے گز کا کپڑا ایک گز ساڑھے سات گرہ کتنے کا ہوا۔ تم کو سوچنا
پڑے گا کہ پونے چودہ چھٹانک کا گھی سات پیسے کا کتنا ہوا۔ مگر وہ
چٹکی بجاتے ہی بتا دیں گی۔ اگر تم کو تعجب ہو تو میری نانی اماں بیٹھی
ہیں ان کا امتحان لے لو۔

تو بہنو! انہوں نے ہرگز ہرگز تعلیم نسواں کو ہاتھ سے نہ دیا۔
تعلیم دی اور وہ تعلیم جو اسلام کا عین منشا تھا۔ خیالات پلٹنے
نہ دیئے۔ مذہب کو مقدم رکھ کر ہر ضرورت کو اس کے تحت میں
سمجھا۔ اب بھی مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اور پہلے بھی دیتے
تھے۔ مگر اس طرح کہ مذہب ہاتھ سے نہ جائے مسلمان بیبیوں کا

وہ فریق یا مردوں کا وہ گروہ جو تعلیم جدید کو مقدم سمجھ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ زمانہ کی رفتار اس کے ساتھ ہے۔ وہ جو کہے درست مگر حق یہ ہے کہ ان کو علم صرف اتنا ہی حاصل ہوگا کہ ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیں۔ یا اعلیٰ لباس پہن کر تفریح کر لیں۔ بہت تیر مارا تو کسی شہر کا نام انگریزی میں لکھ لیا۔ مگر یہ جو کچھ اس طریقہ تعلیم سے (مشن سکولوں میں پڑھنے سے) حاصل ہوگا اس زبردست قربانی کے بعد جس کا نام مذہب ہے"۔

تقریر ختم کرتے ہی زاھدہ آگے بڑھی۔ ایک کشتی اُٹھائی جس میں دو سنہرے جوڑے اور کچھ روپے تھے رحیمن کے پاس آئی اور کہا:۔

"میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ خدارا شاھدہ کا یہ نصیب کا قصور معاف کیجئے۔ یہ صرف آپ کی آہ کا اثر ہے کہ وہ کمبخت آج تک نہ پنپی"۔

رحیمن نے زاھدہ کو گلے لگا لیا اور کہا:۔

میں ایک معمولی ماما ہوں۔ اس قابل نہیں کہ آپ مجھ کو اس طرح شرمندہ کریں۔ بچی خدا تیری عمر دراز کرے۔ تیرا گھر آباد اور تیری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ چھوٹی بیوی کا نام میرے سامنے نہ لو۔ میری آبرو ان کی بدولت غارت ہو چکی۔ اور آج تک میری بچی کو بُرنہ جڑا۔ میں جیل خانہ پہنچی، اور حوالات میں رہی۔ بیوی اس سے زیادہ مصیبت کیا ہوگی۔ رات کے وقت میری کواری بچی میری آنکھ سے اوجھل ہوئی۔ میں اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ وہ طاقتور ہیں، امیر ہیں، پڑھی لکھی ہیں۔ میں بچاری کمزور ہوں، غریب ہوں، بدلے کے لائق نہیں۔ مگر جس کے آگے پانچ وقت سر جھکاتی ہوں۔ وہ شاھدہ بیوی سے زیادہ طاقتور ہے۔ میرا بدلہ ضرور لے گا"۔

اتنا کہہ کر رحیمن کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ کھڑی ہوگئی

ہر چند سب نے روکا۔ مگر اس کی حالت ایسی خراب ہوئی کہ وہ نہ ٹھہری اور چل دی۔

شام کے وقت مہمان اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ دوسرے روز صبح کے وقت جب زاھدہ میاں کو کھانا کھلا چکی تو پندرہ روپے دئے اور کہا:۔

"آج ہی دُلہن بیگم کو روانہ کر دو"۔

احسان۔ "نہیں، ہرگز نہیں"۔

زاہدہ۔ "نہیں یہ فیصلہ غلط ہے۔ وہ نکاح میں ہیں اور ان کی خبر گیری تمہارا فرض ہے۔ دُنیا کے دھندے چل رہے ہیں، چلے جائیں گے۔ مگر خدا کے ہاں بوجھ اپنے سر پر نہ رکھو"۔

احسان بیوی کی انسانیت کا معترف پہاڑ پر ہو چکا تھا۔ یہاں پہنچکر جب یہ دیکھا کہ زاھدہ ملازمت سے زیادہ بیکاری میں فرمانبردار نکلی تو اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اس وقت زاھدہ نے یہ تقریر کی تو اُن تمام مظالم کی تصویر جو احسان نے پہاڑ پر توڑے آنکھ کے سامنے پھر گئی۔ اور اُس نے سوچا کہ انتہائے انسانیت ہے اور صرف جوھر قدامت کہ جس شقی القلب عورت کے ہاتھوں اس غریب پر یہ کچھ گذر گئی چور بنی۔ مکار ٹھہری۔ گھر چھوڑا۔ بار چھوڑا۔ اس وقت بھی اس کی سفارش کر رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی بیساختہ احسان چیخ اُٹھا کہ "بیشک زندگی تم ہی جیسی بیویوں سے سنور سکتی ہے جنہوں نے انسانی ہیئت میں شوہروں کو جنّت کا نمونہ دکھایا"۔

احسان کی حالت کا انقلاب عارضی نہ تھا۔ جو بیوی نے چند ہی روز میں درست کر دیا۔ اور وہ شخص جو پہاڑ پر صرف دُنیا ہی کو زندگی سمجھتا تھا بیوی کے طفیل اتنا دیندار ہوا کہ گھر سے دفتر تک جاتا تو درود شریف پڑھتا ہوا۔ دل میں خلوص اور نیت نیک تھی۔ خدا کی رحمت نازل ہوئی۔ اور کچھ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ احسان ستّر روپے ماہوار پر پہنچ گیا۔

تیسواں باب

سُنا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ حسن جیسا عاشق زار شوہر اور غمخوار رفیق جو قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا شاہدہ سے ایسا بیزار ہوا کہ صورت زہر معلوم ہونے لگی۔ بچہ جو آنکھوں کا تارا' اور کلیجے کا ٹکڑا تھا غیروں کی مانند الگ تھلگ رہتا اور دشمنوں کی طرح گھورتا۔ باپ جو صورت کا عاشق' اور نام کا دیوانہ تھا مہینوں آکر نہ جھانکتا۔ حسن شروع شروع تو بیوی سے دو قدم آگے ہی تھا۔ اگر وہ ترقی کی دلدادہ تھی تو یہ پردے کا دشمن۔ مگر واقعات نے بتا اور حالات نے سمجھا دیا کہ یہ جدت کا دور دیکھنے میں شہد۔ مگر اندر سے زہر ہلاہل ہے۔ طبیعت ہٹی' خیال پلٹا' راستے بدلی' ادھر جھکا تو ساس اور سالی دونوں کی زندگیاں جنت تھیں۔ برکت تھی۔ پتہ لگ' اور سُراغ مل گیا۔ کہ قدامت کہنے کو جہالت' مگر درحقیقت امرت ہے۔ اور یہ ترقی کے نعرے دیکھنے میں پیارے ہوں۔ مگر آگ کے شرارے ہیں۔ ترقی اگر ممکن ہے تو صرف مذہب کے ساتھ اور مذہب ان جاہلوں کا مجھ جیسے پڑھے لکھوں سے بدرہا اعتبار بہتر کہ ملیگا تو غریبوں میں رہے گا تو مفلسوں میں' اور ختم ہوگا تو ان ہی بیچاروں پر۔

خدا کی قُدرت تھی کہ وہی حسن جو ترقی کے نعرے لگاتا چاروں طرف پھرتا تھا جس کی تحریر اور تقریر' جس کا گھر اور بار' جس کی بیوی اور بچّے جدّت کا مکمل وعظ تھے جس کی زبان سے زقلم کے سوا کبھی خدا کا نام نہ نکلا۔ اس خشوع اور خضوع سے نماز پڑھتا کہ دیکھنے والے تعجّب کرتے۔ شاہدہ اس کی نماز پر اس کی دُعا پر ہنستی۔ مسکراتی' تعجّب کرتی۔ وہ دل ہی دل میں دانت پیستا تیوری چڑھاتا۔ دیکھتا جو ہوتا اور سُنتا جو کہا جاتا۔ مگر زبان سے ایک حرف نہ کہتا۔ اتفاق دیکھو کہ کلب کا ہوا سالانہ جلسہ' دُور دُور سے آئیں عورتیں۔ دھواں دھار ہوئیں تقریریں۔ اور صدر جلسہ نے اپنی

چھپی ہوئی تقریر اس طرح پڑھی جس کا مفہوم یہ تھا :۔

"ہمارا جہالت کا زمانہ ختم ہوا۔ ہم میں جو چند پرانی عورتیں زندہ ہیں وہ چند روز کی مہمان ہیں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا اب فرض ہے کہ وہ کوشش کریں جو ہماری لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنا دے"۔

اتفاق کی بات ہے کہ بہن کے بیحد اصرار سے اس جلسہ میں زاہدہ بھی چلی گئی تھی۔ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ ورنہ وہ کہاں اور اس قسم کے جلسے کہاں۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ پہلی ہی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے فرحت کے کلفت ہوئی۔ تقریر سنتے ہی بدن میں آگ لگ گئی۔ بھری بیٹھی تھی۔ کہ گیدڑ کی شامت آئی۔ اور شہر کی طرف رخ کیا۔ شاہدہ جو اس وقت پورے زوروں پر تھیں اور ایک سے ایک بڑھے چڑھے حامی موجود تھے۔ بہن سے کہنے لگی:۔

"آپ کیوں خاموش ہوگئیں۔ کچھ فرمانا ہے تو فرمایئے"۔

صدرِ جلسہ ۔ "ہاں ضرور ضرور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے زرّیں خیالات سے مستفید ہوں"۔

دوسری لڑکیاں ۔ "بیشک بیشک محترمہ ضرور ارشاد ہو آپ کی بہت تعریف سنی ہے"۔

شاہدہ ۔ "آپ سب بیویاں خاموش ہوجائیں۔ میری ہمشیرہ محترمہ مسز احسان کچھ فرمانا چاہتی ہیں"۔

بیویاں خاموش ہوگئیں۔ اور سب کی شرماشرمی زاہدہ کھڑی ہوئی اور کہا:۔

بہنو! مجھے آج آپ کے جلسہ میں شریک ہوکر خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی اس بات کی کہ بہنوں میں اپنی حالت کی پستی کا احساس

شروع ہے۔ اور اُمید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بہت کچھ ترقی کریں گی اور
افسوس اس امر کا جہاں صدر جلسہ کی تہذیب یہ ہو کہ نانیوں اور دادیوں کو
جاہل کہنے میں بھی باک نہ ہو۔ ہاں حاضرین تو بابا آدمؑ اور اماں حوّا
کو جو کچھ بھی نہ کہیں وہ تھوڑا۔

میں اس وقت کسی تقریر کے واسطے تیار نہیں ہوں۔ اور اس لئے
اراکین جلسہ کی طرح میرے پاس کوئی لکھی ہوئی تقریر موجود نہیں
جو میں طوطے کی طرح رٹ کر آپ کے روبرو پڑھ دوں۔ میں جلسہ
کی صدر صاحبہ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

بڑی بوڑھیوں کو جاہل کہہ دینا صرف زبان کا ایک سکنڈ کا کام ہے
اس میں ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکری۔ جو لوگ خدا کے مُنکر ہیں ان کو
بھی یہ کہتے ہیں کہ خدا کوئی نہیں کچھ زیادہ سامان کی ضرورت نہیں
ہوتی۔ صدر صاحبہ نے نہایت اطمینان سے پُرانی عورتوں کو جہلا میں
شامل کر دیا۔ میں اس سے پہلے بھی یہ لغو جملہ بعض لڑکیوں سے سُن چکی
ہوں۔ مگر بحث یہ ہے کہ کیا زبان سے کسی کو کچھ کہہ دینا کافی ہو سکتا ہے
اگر میں اس وقت یہ کہوں کہ میں عورت نہیں مرد ہوں تو کیا یہ میرا
کہنا صحیح ہوگا؟

ضرورت ہے کہ ہر دعوے کے ساتھ ثبوت ہو۔ زیادہ سے
زیادہ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہالت کا ثبوت اس سے
زیادہ کیا ہوگا کہ اُن کے عقیدے درست نہ تھے، وہ تعویذ گنڈے
ٹونے ٹوٹکوں وغیرہ کی قائل تھیں، وہمی تھیں۔ بہت سی کمزور
باتیں ان کے معمولات میں شامل تھیں۔ مگر میں کہتی ہوں یہ صحیح نہیں

مجھے اس سے انکار نہیں کہ وہ وہمی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں
کہ انکے بعض عقیدے کمزور تھے۔ مثلاً انکو وہم تھا کہ سیتلا جس بچہ کے نکل
رہی ہو۔ اسکے پاس دھوبن نہ آئے۔ یا زچہ کے پاس دھوبن نہ آسکے ورنہ بہت برا ہوگا۔
یہ یا اس قسم کی اور باتیں ہیں جو ثبوت میں پیش ہوسکتی ہیں۔ مگر کیسے افسوس
کی بات ہے کہ دیدہ دانستہ جان بوجھ کر انصاف کی آنکھوں پر ہٹ دھرمی
کی پٹی باندھی جاتی ہے۔ پھولوں کو کانٹے اور موتیوں کو پتھر ثابت کیا
جارہا ہے۔ کیا کوئی ذی عقل اس سے انکار کرسکتا ہے کہ ماں کے مقابلہ میں دنیا
کی کوئی شے وقعت رکھتی ہے۔ ایک بچہ کو چیچک نکل رہی ہے۔ ماں رات دن اسکو
گود میں لئے رہتی ہے۔ اگر اس کو یہ یقین دلایا کہ دھوبن کا آنا بچہ کیواسطے
مضر ہے تو وہ زبردست احتیاط اور روک تھام کی گئی جس کا عشر عشیر
بھی آج نہیں ہوتا۔ بچہ چیچک میں ہے۔ ماں معمولی مرض میں گرفتار نہیں۔
مرض متعدی ہے۔ اور بہت ممکن ہے ماں پر بھی اثر ہوگیا ہو۔ قوی شبہ ہے
کہ گھر کے کپڑوں میں اثر موجود ہے۔ اگر یہ کپڑے دھوبن کو دیئے گئے
اور اس ذریعہ سے جراثیم ان تمام کپڑوں میں پہنچ گئے جو دھوبن کے ہاں
موجود ہیں تو تمام شہر اسی مرض میں گرفتار ہوجائیگا۔ بتاؤ یہ جہالت تھی یا
علمیت کیسی اچھی طرح ایک بات بتادی۔ ان کے ذہن میں تو یہ باتیں بطور عقیدہ
کے ہوتی تھیں۔ مگر ان تمام باتوں کی اصلیت پر غور کرو تو اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہیں
یہ ہی کیفیت زچہ اور بچہ کی ہے۔ دھوبن کے یہاں کسی ایسے ویسے
گھر سے کپڑے آئے جہاں مرض متعدی ہے تو اس کو زچہ بچہ کے پاس
نہ آنا چاہئے۔ بچہ نازک ہے اور بہت جلد اثر قبول کرلے گا۔ جس بات کو
تمہارا جی چاہے لے لو۔ جہالت نہیں پوری علمیت ثابت ہوگی اور جس

علوم کا تم نے فقط نام ہی سُنا ہے وہ اس طرح ان سے ماہر ہوتی
تھیں تم کہتی ہو گی کہ یہ باتیں ان کی گھٹی میں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ وہ اس کی
اصلیت کو بلا سوچے سمجھے پتھر کی لکیر سمجھتی تھیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہو گا
معمولی عورتوں کی تو کہتی نہیں۔ مگر شریف خاندان کی خواتین ان گُروں سے
اچھی طرح آشنا تھیں۔ رہے گنڈے تعویذ اس کا مجھے اعتراف ہے کہ
یہ رغبت ان میں نسبتاً زیادہ تھی۔ لیکن اس کو میں جاہلیت سے منسوب
نہیں کر سکتی۔ اور یہ کہوں گی کہ دُنیا جیسے ناپائیدار خدا کے خاص بندوں
سے کبھی خالی نہ رہی۔ اور تاریخ مسلمانوں میں ان پاک نفوس کا وجود
ثابت کر رہی ہے۔ جن سے یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ ان کی التجاؤں کا بارگاہ
صمدی میں قبول ہونا زیادہ ممکن ہے۔ یہی ہے وہ رجوع جسکو تم گنڈے
تعویذوں سے تعبیر کر لو۔ مگر یہ سچ ہے کہ زمانہ کی موجودہ ترقی کے ساتھ ہی ایسے
لوگوں کی تعداد بھی بڑھی۔ جو درحقیقت کچھ نہ تھے۔ مگر وہ دنیا کے سامنے
اس لباس میں جلوہ گر رہے۔ اس دورِ جدید کے ایک اعتراض کا جواب
میرے پاس نہیں کہ مذہب ہی جہالت ہے۔ یہ آپ زبان سے نہ فرمائیں مگر واقعات
آپ کے اس خیال کی تائید کر رہے ہیں۔ اگر مذہب کا نام جہالت ہے تو یہ جہالت
انہیں ضرور موجود تھی۔ غالباً ترقی سے آپ کا مقصود یہی ہے کہ جہالت یعنی
مذہب بتدریج کم ہو اس میں آپکو ضرور کامیابی ہوئی اور مذہب کی عظمت
روز بروز گھروں سے اُٹھ رہی ہے۔ جاہلوں کا یقین یہ تھا کہ جس گھر میں بارہ برس
کی لڑکی بے نماز ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔
اگر صبح اُٹھ کر نماز سے فارغ ہو کلام اللہ پڑھا جائے تو دن ہی خوشی سے گذرتا ہے۔
رات کو سوتے وقت بچھونوں میں لیٹ کر کلام اللہ پڑھ دم پڑھ کر مُردوں کو

پہنچاؤ کہ ان کو ثواب ملے اور عذاب میں تخفیف ہو۔

دسترخوان سے اگر کسی غریب مسکین کو کھانا چلا گیا تو کھانے کا حساب نہ ہوگا

وعظ اور ذکر ولادت گھر میں اکثر ہونا چاہیئے۔

بارہ برس سے کم کے بچے اگر بغیر نماز پڑھے مر گئے تو ان کا عذاب ماں باپ پر ہوگا۔

رات کو سوتے وقت آیت الکرسی پڑھ کر سوؤ تو ہر قسم کے ڈر اور خوف سے محفوظ رہو گے۔

شیطان کو سب سے زیادہ اذیت معصوم بچوں کے سجدے سے ہوتی ہے۔

کواری لڑکیوں کو جوان لڑکوں سے ہنس کر بات نہ کرنی چاہیئے۔

سفید بالوں کا ادب کرو۔ ان کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

بڑا نوالہ کھاؤ۔ بڑا بول نہ بولو۔ یعنی غرور نہ کرو۔

بچہ کو گود میں اٹھاؤ تو بسم اللہ کہہ کر تاکہ یہ آواز اس کے کانوں میں پڑے۔

درود شریف گھر میں پڑھنے سے برکت ہوتی ہے۔

غالباً جہالت سے آپ کا مقصد یہ عقائد ہیں۔ اور مجھ کو یہ حق حاصل ہے کہ میں آپ کو مبارکباد دوں کہ آپکی کوشش کامیاب ہوئی اور یہ جہالت اب بہت کم ہو گئی۔ یہ آوازیں اب مسلمان بہت کم سنتے ہیں۔ جاہل بیویوں کے عقائد کا انحصار اس شخص کے الفاظ اور ارشاد پر تھا جو خاک عرب سے اٹھ کر تمام روئے زمین پر ڈنکا بجا گیا۔ اور فرما گیا "جو مخلوق کے نزدیک اچھا، وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا۔ اور جو مخلوق سے برا وہ خدا سے بھی" انکی کوشش یہ تھی کہ مرنے کے بعد جن لوگوں سے زندگی میں سابقہ پڑا ہے وہ انکی میت پر روئیں۔ مجھے معاف کرنا اگر میں کہوں کہ تعلیم یافتہ بیویوں کے کارنامے انکی زندگی میں اخباروں اور رسالوں میں چھپتے تو دیکھتی ہیں لیکن ان کو

رونے والے غیروں میں کیا اپنوں میں بھی نہیں کیونکہ ان کے وجود سے حقیقی
مسرت کسی متنفس کو نہیں پہونچی۔ مجھ کو اپنی بڑی نانی اماں یاد ہیں۔ بیس برس
سال کی تھی اور جو منظر اس وقت میری آنکھوں نے دیکھا عمر بھر یاد رکھوں گی
رات کو تین بجے انہوں نے انتقال کیا اور صبح تک یہ خبر تمام شہر میں مشہور
ہوگئی۔ جنازہ صحن میں رکھا تھا کہ محلہ کی غریب عورتیں لپٹ لپٹ کر چیخیں
مارنے لگیں۔ یتیم بچے چارپائی سے لپٹ گئے۔ رانڈیں قبرستان تک
پچھاڑیں کھاتی ساتھ تھیں۔ میں بچہ تھی سمجھ نہ سکی بعد میں معلوم ہوا کہ
ان میں سے کسی کی تنخواہ مقرر تھی، کسی کا کپڑا، کسی کا کھانا۔ وہ جاہل تھیں
مگر ایسی جاہل کہ آج ان کے شاگرد شہر میں ایسے جید حافظ موجود ہیں
جو ہر سال تراویح میں ان کی جہالت کے کارنامے بلند کر رہے ہیں۔"
شاہدہ نے تو بہت کو زک دینے کا ایک موقعہ تاکا تھا۔ مگر الٹی ٹانگیں گلے میں آگئیں۔
زاہدہ کی تقریر سے مجلس میں ایک سناٹا چھا گیا۔ دیکھنے میں تو سب خاموش تھے مگر بعض دلوں میں ابال اور بعض پر

چھبیسواں باب

اسحٰق کی زندگی عجیب زندگی تھی وقت کا بڑا حصہ علماء کی صحبت اور مذہب کی
خدمت میں بسر ہوتا کڑکڑاتے جاڑوں کی ان راتوں میں جب مامائیں شاہدہ کے سرہانے اور
پائنتی دہکتی ہوئی انگیٹھیاں روشن کرتیں وہ چار بجے اٹھ کر مسجد میں آتا۔ اور اپنے ہاتھ سے نمازیوں کے وضو
کا پانی گرم کرتا۔ آدمی خوش الحان تھا صبح کی اذان اس جوش و خروش سے دیتا کہ سننے والے تھرا جاتے۔
اندیشہ تو یہ تھا کہ شاہدہ کے لڑکے شاہد کا ماں کے پاس رہ کر اور اسکی ہٹ وتی
پر اٹھ کر ناس ہوگا۔ اور وہ باپ کو مخبوط الحواس سمجھے گا۔ مگر وہ مذہب کے اعتبار سے اس
وقت کا دوسرا باپ تھا۔ تعجب ہوتا اور خدا کی قدرت یاد آتی تھی کہ جس ماں نے سوا کلب

سے کبھی گھر پر خدا کا نام نہ لیا اس کا بچہ اور لنگوڑے کی کچھ بساط بھی تو نہیں۔ بارہ برس کی جان، اور ایسا مسلمان کہ جیٹھ بیساکھ کے روزے رکھے۔

شاھدہ یہ تو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میاں اور لڑکا دونوں میرے ڈھنگوں سے خوش نہیں۔ مگر وہ دونوں کو جاہل اور بے وقوف جان رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اس کے دامن پر ایک ایسا دھبہ تھا کہ وہ بات تک کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ مگر خدا بے غیرتی کا بھلا کرے کبھی آنکھ جھپی نہ دل نادم ہوا۔ اکڑتی اسی طرح اور پھیلتی اس سے زیادہ، ہماری رائے میں تو بدنصیب کی بربادی کا سارا بار باپ کی گردن پر ہے۔ یہ صحیح کہ وہ خود راہ راست پر آچکا تھا۔ مگر جو بیج بو دیئے تھے۔ اس کے پھل کیوں کر غارت ہو جاتے۔

خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں شاھدہ کی لامذہبی حسن اور شاھدہ دونوں کے واسطے تازیانہ ہوئی۔ اور دونوں نے مصمم قصد کیا کہ اپنی زندگی قوم کے واسطے وقف کردیں اور دُنیا کو دکھادیں کہ تعلیم نسواں کیا چیز ہے۔ حسن کے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ اس نے بسم اللہ کہہ کر مدرسہ کھول دیا۔ اور تعلیم شروع کر دی۔ مسلمان اُستانیوں کا ملنا مشکل تھا۔ جو میسر آگئیں ان کو سر آنکھوں پر رکھا۔ اور جو کمی رہی حسن نے اپنی ذات سے پُوری کی۔ انتظام یہ تھا کہ چھ برس سے دس برس تک کی لڑکیاں داخل ہوسکیں۔ حسن ان بچیوں کو خود پڑھاتا، لکھاتا، مذہبی تعلیم ہر لڑکی کے واسطے لازمی تھی۔ اور باقی والدین کی خوشی پر منحصر۔ مدرسہ کا شوق ایسا ہوا کہ حسن بیوی بچے گھر بار سب بھول گیا۔ دن رات وہ تھا، اور مدرسہ تھا۔ چند روز میں مدرسہ اس قدر ترقی کر گیا کہ دُور دُور سے لڑکیاں آئیں اور داخل ہوئیں۔ چار سال کے بعد جو لڑکیاں کامیاب ہو کر نکلیں وہ قوم کا مول تھیں۔ علوم جدیدہ کی مہارت کے ساتھ مذہب ان کی رگ رگ میں پیوست تھا۔ اندر کا تمام کام حسن کے سُپرد تھا۔ انتظام شاھدہ کے۔ حسن کی نیت پاک اور کوشش صاف تھی۔ خدا نے برکت دی۔ اور حسن نے دکھا دیا کہ مذہب نظر انداز نہ ہو تو تعلیم نسواں اسلام کا جزو اعظم ہے۔

شاھن اب باپ کا برابر کا بازو کامیابی کا راز اور اس کے تمام مقاصد کی جان تھا۔ اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر جو وقت بچتا سب باپ کی کوششوں میں صرف کرتا۔ مدرسہ کا سالانہ [illegible] رلی کے وقت اٹھ کر نہایا۔ نماز پڑھی۔ مدرسہ [illegible] بتاؤ کیا ہوا"؟ [illegible] مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف تھا کہ گردہ میں کسک [illegible] ہوئی۔ دوپہر تک ٹالتا اور پھرتا رہا۔ مگر ظہر کے بعد تو مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ [illegible] مہمان تھی، اور ایک زہین شاھق بیٹے سے متنفر اور بیٹا اس سے بیزار۔ مگر ماں تھی سنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ گھبرا کر اُٹھی اور بیتاب ہو کر آئی۔ دیکھتی ہے تو بچہ کا رنگ سفید پڑا ہے۔ سناٹے میں رہ گئی۔ ڈاکٹر، حکیم برابر آ اور جا رہے تھے۔ نسخہ پر نسخہ اور لیپ پر لیپ بدلا جا رہا تھا۔ مگر درد تھا کہ کسی عنوان کم نہ ہوتا تھا۔ درد بچہ کے گردہ میں تھا۔ اور ماں کا کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کے منہ پر منہ رکھتی تھی۔ اس کی کمر پکڑتی تھی۔ شاھن کی تکلیف جسمانی تھی اور شاھق کی روحانی۔ مگر شاھق کی اذیت بچہ سے کم نہ تھی۔ اسکی ہر جنبش اور ہر آہ کیساتھ بے چین ہوتی۔ روتی بلکتی اور جسوقت کہتا:۔

"ہائے اماں جان کیا کروں"؟

تو گلے میں ہاتھ ڈال کر لپٹ جاتی۔ دن یوں ہی اور رات ساری اسی کرب و اضطراب میں بسر ہو گئی۔ شہر بھر کے علاج اور دنیا بھر کے جتن کر ڈالے۔ مگر درد میں فرق نہ پڑا۔ مجبوراً ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی تو ذرا آنکھ لگ گئی۔ شاھق کروٹ میں بیٹھی ٹکٹکی باندھے بچے کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اور حسن الگ خاموش بیٹھا تھا۔ حسن کا حال جو کچھ بھی ہو مگر شاھق کی کیفیت تو یہ تھی کہ دل اُمڈا آتا اور کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کی موت کا خیال ایک بجلی تھی جو سر سے پاؤں تک ایک عجیب حالت پیدا کر دیتی تھی۔ چونک پڑتی تھی اور آہستہ سے اسکے منہ پر ہاتھ پھیر کر ٹھنڈا سانس بھر لیتی تھی۔ شاھق ان ہی خیالات میں منہمک اور افکار میں مستغرق تھی کہ مسجد سے صدائے توحید بلند ہوئی۔ اور مؤذن کی اذان نے رات کی خاموشی کا

سلسلہ ٹوٹا۔ چاند مدھم، اور تارے پھیکے پڑکر حیاتِ انسانی کی بے ثباتی کا درس دے رہے تھے۔ اذان سنتے ہی حسن یہ کہہ کر اُٹھا :۔

"حق نام تیرا"

شمع کی بتی سامنے جِھلملا رہی تھی کہ شاہدہ کی نظر پڑی۔ اور اس نے دل میں سوچا یہ ہی کیفیت انسانی [illegible] ہے۔ سچ یہ ہے کہ دُنیا کا [illegible] ت فانی۔ باقی رہنے والی ہر تو وہی ایک ذات [illegible] کیجیے، وہ اور آپ ہمیشہ خوش [illegible] یقین پھر آنکھ کے سامنے آیا۔ بلبلا اُٹھی۔ یہ پہلا روز بلکہ پہلا اتفاق تھا کہ شاہدہ نے زبردست طاقت کا اعتراف کیا۔ اور فوراً قصد کیا کہ عاجزی کا سر اس کے حضور میں جُھکا کر بچہ کی سلامتی کیواسطے التجا کروں۔ اُٹھی، وضو کیا، نماز کو کھڑی ہوتی تھی۔ اور اگر نماز ہو جاتی تو یہ پہلا سجدہ تھا جو ایک فرنٹ عورت کی طرف سے خدا کے حضور میں ہوتا۔ مگر بچہ کی اس آواز نے :۔

"ہائے اماں میری جان نکلی"۔ پریشان کردیا۔ اور دوڑی اور یہ کہہ کر آئی۔

"میں اپنے بچہ کے قربان"۔

بیہوش بچہ کا سر ماں کی گود میں تھا۔ جھنجھوڑتی تھی، جگاتی تھی، چلاتی تھی۔ مگر ہر کوشش بے سود اور بیکار تھی کہ شاہدہ ماں کی گود میں ایک ہلکی سی سسکی لیکر ختم ہوگیا۔

پچیسواں باب

[زاہدہ کو پہاڑ سے آئے ہوئے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک روز خلافِ معمول دو بجے احسان متفکر و مغموم دفتر سے آکر اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھ گیا۔ زاہدہ اس کے اس طرح بے وقت اور چُپ چاپ آنے سے پریشان ہوگئی، اور پوچھا :۔]

"خیر ہے اس وقت کیسے آئے؟ جی تو اچھا ہے"؟

احسان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ بیوی کی صورت دیکھ کر دل بھر آیا۔ مگر ضبط کیا اور کہنے لگا:۔

"خیریت کیا ہے، جو کیا اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ دیکھئے کب تک بھگتنی پڑتی ہے"۔

زاہدہ ۔ "آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا، کیا کام میں کوئی غلطی ہوگئی" ؟

احسان ۔ "نہیں کام میں تو غلطی نہیں ہوئی، ہاں زندگی کی غلطی کی سزا مل گئی"۔

زاہدہ ۔ "صاف صاف بتاؤ [illegible] تھی، اور ایک زین پیشا ہو"

احسان ۔ "کیا بتاؤں، اور کس منہ سے بتاؤں، آج افسر نے بلا کر بہت سخت سست کہا اور موقوف کر دیا۔ اس کمبخت نے جو دلہن کی حیثیت سے آئی تھی اور جس سے نکاح کرنا زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ مہر کا دعویٰ کر دیا۔ کل مقدمہ سے خسر صاحب تشریف لائے تھے۔ نہ معلوم صاحب کے کان میں کیا بھرا کہ نوکری بھی گئی، رسوائی بھی ہوئی۔ میں جب باہر نکلا ہوں تو وہ خود بھی برقع اوڑھے باپ کے ساتھ برٓک کے نیچے کھڑی تھی۔ ایسی خلاف تہذیب باتیں کی ہیں کہ زبان سے نہیں اُلٹ سکتا۔ میں نے سب باتوں کا جواب دیا۔ والد صاحب کھڑے سنتے اور ہنستے رہے۔ بھیا آخر میں کیا کہتی ہے۔

" اب میں تمہارے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ جس قدر جلد ممکن ہو مجھ سے قطع تعلق کرو۔ اگر تم کہو گے تو میں مہر میں سے کچھ حصہ چھوڑ دوں گی"۔

زاہدہ ۔ "تشویش کی بات ضرور ہے۔ لیکن خدا پر بھروسہ کرو، وہی ہر مشکل آسان کرتا ہے"۔

آج دن کا باقی حصہ اور ساری رات گھر بھر میں پریشانی کی گذری، علی الصبح زاہدہ ڈولی کرا کے لڑکے کو ساتھ لے ہوٹل میں پہونچی۔ بیگم صاحبہ نے اندر آنے کی اجازت دی۔ مشنری کی صحبت یافتہ مہذب بیوی۔ اور اُنکے والد صاحب کے قہقہہ نے زاہدہ کا استقبال کیا۔ اور جب زاہدہ نے لڑکے سے یہ کہلوایا کہ اگر آپ کے والد صاحب اجازت دیں تو چند لمحہ

تنہائی میں گفتگو کرنی چاہتی ہوں، تو اس کا یہ جواب ملا "ایسی کیا تخلیہ کی بات ہے، تمہارے شوہر نے جو دغا دی اس کا ثمرہ اس کو بھگتنا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری وجہ سے اپنے والد کو باہر جانے کی تکلیف دوں۔ تم ہی جیسی جاہل کندہ ناتراش عورتوں نے عورت کے نام کو بٹہ لگایا۔ احسان یقیناً سزا کا مستحق ہے۔ اور میں ہرگز درگذر نہ کروں گی"۔

زاہدہ۔ "وہ آپ کے شوہر ہیں۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ اگر اُن سے کوئی غلطی ہوئی تو زیادہ خیال نہ کیجئے، وہ اور آپ ہمیشہ خوش رہے ہیں۔ ان کی اور آپ کی دونوں کی ہر ممکن خدمت کو حاضر ہوں"۔

سوکن۔ "تمہاری جہالت افسوسناک ہے۔ تم میرے سامنے ایسے فریبی انسان کا نام مت لو۔ وہ میرا شوہر نہیں ہے۔ ایسے دغا باز کو میرا شوہر کہنا میری توہین ہے۔ وہ تم جیسی ذلیل عورتوں کے قابل ہے۔ میں ایسے بے ایمان مفلس کا لیکر کیا کروں گی۔ اب آپ تشریف لے جائیے، مجھے کچہری جانا ہے"۔

زاہدہ۔ "میں مہر کے متعلق اس قدر عرض کرنا چاہتی ہوں"۔

سوکن۔ "بس بس زیادہ پریشان نہ کیجئے، میں کچھ سُننا نہیں چاہتی"۔

زاہدہ اُلٹے پاؤں واپس ہوئی تو احسان دالان میں ٹہل رہا تھا۔ دریافت کیا "کہ کہاں گئی تھیں"؟ مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور خود ہی دریافت کیا کہ کچہری جاؤ گے"؟

احسان۔ "جا کر کیا کروں گا! اور سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوں گا"۔

باوجود انتہائی کوشش کے مقدمہ اور بیکاری یہ دو حملے ایسے ہوئے کہ زاہدہ ایک لمحہ کے واسطے شوہر کو خوش نہ دیکھ سکی۔ اس واقعہ کا تیسرا ہفتہ تھا کہ دوپہر کے وقت ایک دن میاں بیوی مالی ضروریات پر غور کر رہے تھے کہ باہر سے کسی شخص نے آواز دی۔ احسان باہر گیا تو معلوم ہوا کہ مہر مجل کی ڈگری میں گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ احسان نے اندر جانا چاہا تو اجازت نہ ملی اور احسان جیل خانہ پہنچ گئے۔

چھبیسواں باب

مقدمہ کی کامیابی سے خوش ہوکر زاھدکا کی سوکن نے کلب میں جلسہ کیا اور خاتمہ پر ایک مختصر تقریر میں فرمایا:۔

" مردوں کو اگر اُن کے اعمال کی اس طرح کافی سزا ملتی رہے تو قوم بدبخت بہت جلد اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہوجائے۔ نصف سے زیادہ قوم ان سنگدل افراد کی بدولت مردہ ہوچکی۔ اور اب ہم صرف اس مرض کی دوا ہیں کہ ان کے احکام کی تعمیل کریں۔ اور لونڈیوں کی طرح حکم بجا لائیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر اسی طرح مسلمان عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ سلوک کریں تو چند ہی روز میں مردوں کی بدسلوکی کا خاتمہ ہوجائے۔ خوشی کی بات ہے کہ دغاباز احسان اسونت اپنے کیئے کی سزا بھگت رہا ہے۔ اور جیل خانہ کی چاردیواری میں سڑ رہا ہے۔"

تقریر ختم ہوئی تو سامنے کے کونہ سے ایک برقع پوش عورت اُٹھی۔ اسکے کپڑے میلے تھے۔ اور بال پریشان۔ اس نے کھڑے ہوکر کہا " اجازت ہو تو چند منٹ میں بھی کچھ کہوں؟" بیویاں اس کا مُنہ تکتی رہیں۔ اور ایک نے کہا " فرمایئے" تو زاھدکا نے کہا:۔

" آپ جیسی محترم خواتین لاریب مسلمان عورتوں کیواسطے قابلِ عزت ہیں اور نہایت مبارک ہوگا وہ وقت جب مسلمان عورتیں مردوں کی ناجائز گرفت سے آزاد ہوکر وہ حقوق حاصل کریں گی جو مذہب مقدس نے ان کو عطا فرمائے۔ مگر کیا آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیں گی کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا۔ اور جو زندگی آپ بسر فرمارہی ہیں یہ اسلام اور مسلمانوں کیواسطے کس حد تک قابلِ فخر ہے۔ اس سوال کا جواب عنایت فرماکر ممنون کیجیے کہ

کیا اسلام اس کا نام ہے کہ شوہر بیوی کے ہاتھوں جیل خانہ پہنچے؟
میری محترم بہن کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کو کیا یہ علم نہ تھا کہ آپ جس شخص سے نکاح کر رہی ہیں یہ دوسری بیوی کا شوہر بھی ہے؟ کیا آپ کا اسلام یہی تھا کہ اپنی ایک بہن کے تمام حقوق پامال فرما دیجئے؟ اگر نکاح ثانی اس کا شرعی حق تھا تو شکایت کیسی؟ اور نہ تھا تو آپ اس کی مرتکب کیوں ہوئیں؟ کیا شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ کل آپ جس کی بیوی تھیں۔ وہ آپ کے مہر معجل کی بدولت آج جیل خانہ جائے۔ اور آپ خوش ہوں؟ کیا انسانیت کے یہی معنی ہیں کہ جبتک اس کو دوسری بیوی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا قسم تھا۔ آپ اسکی تھیں۔ اور جب اُس نے آپ کی ایک بہن کو آپ کی ایک جنس اور اپنی بیوی کے حقوق پر توجہ کی تو آپ اس کی دشمن ہوگئیں؟

بیوی اس بدبخت قیدی کی منکوحہ میں ہوں اور جیسا کہ میں کر چکی ہوں اب بھی اس کے واسطے آمادہ ہوں کہ میں اور میرے بچے آپ کی خدمت میں لونڈی غلاموں کی طرح بسر کر دیں گے۔ آپ غور فرمائیے کہ میں نے یہاں سے ہر ماہ آپکو نصف تنخواہ روانہ کی۔ اور جو کچھ خدا نے دیا اس میں آپکے حقوق کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن برخلاف اس کے آپ نے میرے ساتھ جو جو کچھ کیا پہاڑ کے آسمان و زمین، مکان کے در و دیوار اور محلے کے مرد عورت اس کے شاہد ہیں۔ آپ کو وہ وقت یاد ہوگا جب میں بے گناہ آپکے حکم سے نکالی گئی۔ اور آپنے مجھ پر چوری کا الزام اُٹھا کر رو کا۔ زیور کی پوٹلی میرے صندوق سے نکلی اور سینکڑوں عورتوں مردوں نے میرا تماشہ دیکھا! میں نے اس وقت بھی جب میری آبرو خاک میں ملی صبر کیا۔ اور آج بھی تمہاری شکر گذار ہوں۔ آپ کے مہر میں یہ میرا زیور حاضر ہے۔ قبول فرمائیے۔ اور بدنصیب شوہر کو قید سے رہائی دلوائیے۔"

یہ کہہ کر زاھدہ نے سب بیویوں کے سامنے زیور کی صندوقچی رکھدی تو مرحبا مرحبا کے نعروں سے کمرہ گونج اُٹھا۔ زاھدہ کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اور قریب قریب تمام عورتیں سوکن پر لعن طعن کرنے میں اس کی ہمنوا تھیں۔ اسی وقت باضابطہ رسید مہر کی لکھوائی گئی۔ اور اس طرح احسان کو صبح ہی جیل خانہ سے رہائی ملی۔

احسان کے وہ افسر جنہوں نے اس کو موقوف کیا تھا۔ ان کی بیوی بھی جلسہ میں موجود تھیں۔ اُنہوں نے مفصل حال ڈپٹی صاحب سے کہا اور احسان دوبارہ ملازم ہو کر زاھدہ کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ستائیسواں باب

شاھد کی موت کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ حسن آسانی سے برداشت کر لیتا۔ لاکھ سنبھلنے کی کوشش کرتا۔ مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہر وقت وہ تھا اور قبرستان۔ نیند بھوک اُڑ گئی۔ بچے کے غم میں بچوں کی طرح روتا۔ ایک ایک کا مُنہ حسرت سے تکتا، اور کہتا "للہ شاھد کی صورت دکھا دو"۔ طبیعت نڈھال اور دماغ خراب ہو گیا۔ قبر کو چمٹتا، تعویذ کو پیار کرتا، درختوں سے سر پھوڑتا، خاک کو آنکھوں سے لگاتا، روتا، بلبلاتا، چیختا، پیٹتا، پرندوں سے گڑگڑاتا، بادلوں سے ملتجی ہوتا، چاند سے خطاب کرتا، سورج سے سوال کرتا، دن بھر جنگل کی خاک چھانتا، اور رات بھر قبرستان میں واویلا مچاتا۔ چند روز میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچ تھا جس میں سوائے سانس کے کچھ نہ تھا۔ سُرخ و سفید رنگ جُھلس کر سیاہ، اور رہی تھی جیسا ڈیل سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

چار پانچ مہینے اسی طرح بسر ہوئے۔ اور اب حسن کو یقین ہو گیا کہ جس خدا نے زندگی میں میرا لال مجھ سے جُدا کر دیا۔ وہ مرنے کے بعد مجھ سے ملا دیگا۔ دس ہزار روپے کی جائداد بیوی کو دی۔ باقی تمام اثاثہ مدرسہ کے نام وقف کر دیا۔

حسن کی مصیبت سے شہر بھر کو ہمدردی تھی۔ مگر مصیبت بھی ایسی تھی جس میں سب مجبور لاچار تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر ہر شخص کو رحم آتا، آدمی آن کا کیڑا ہے۔ غذا ہوئی بند، چارپائی سے لگ گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر وقت بخار رہنے لگا۔ اب اگر آمدنی تھی تو صرف اس جائداد کی جو شاہدہ کے نام تھی۔ اور یہ کہنا جائز ہوگا کہ میاں سے نا امید ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ موت ٹلنے والی اور صحت ملنے والی نہیں اس نے اس کے علاج پر زیادہ توجہ نہ کی۔ مدرسہ کا وقت شاہدہ کے دل پر دوسرا صدمہ تھا۔ دنیا بدل گئی، اور زمانہ پلٹ گیا۔ شاہد جیسا لال گہری گود میں جا سویا۔ اور حسن جیسا جوان قبر کے کنارے جا پہنچا۔ مگر نہ فرق آیا تو شاہدہ کے ڈھنگوں اور روطیروں میں۔ وہی کلب کے جلسے، وہی ترقی کی دھن، اور وہی مذہب سے نفرت۔ حد یہ ہے کہ میاں کے مرض الموت میں بھی اس کی تفریح ناغہ نہ ہوئی۔ گھنٹوں حسن اکیلا پڑا رہتا، اور کوئی اتنا تک میسر نہ ہوتا کہ حلق میں پانی ٹپکا دے! دوا کی کھٹائی تو تھی ہی نہیں۔ اور تھا بھی کون جو علاج کرتا۔ لے دیکر ایک بیوی ہی بیوی، اس کا بس چلتا تو شاید دو چار سانس پہلے ہی میاں کو پہنچا دیتی۔ علاج، غذا تسکین جو کچھ تھا وہ پانی۔ اس کے بھی لالے پڑ گئے۔ جب بخار نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا تو حسن کی زندگی شاہدہ کو وبال جان ہو گئی۔ بے چاری گھر آ جاتی ورنہ زیادہ وقت کلب میں گزار دیتی۔ دوست آشنا، جان پہچان آتے اور دیکھ دیکھ کر عبرت پکڑتے۔ حالت ردی ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچی کہ ایک رات بالکل بیہوش پڑا رہا۔ شاہدہ نے سر شام یہ کیفیت دیکھ لی تھی۔ مگر پڑ کر جو ڈھیر ہوئی تو آنکھ صبح ہی کو کھلی۔ پاس آئی دیکھا، پوچھا، مگر جواب نہ ملا۔ تو اخبار دیکھنے چلی گئی۔ دس بجے کے بعد آئی تو معلوم ہوا کہ حسن کی روح کبھی کی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

اٹھائیسواں باب

حسن کی موت پر عدت وغیرہ تو جاہلوں کا کام تھا۔ اس لئے شاھن نے جائز رکھی ہی نہیں۔ غضب یہ کیا کہ نماز روزہ کے گیہوں، یتیموں کو کھانا، اور مسکینوں کی خیرات بھی فضول سمجھ کر اڑا دی۔ آمدنی میں کمی وقت کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ مگر دل بڑھا ہوا، حوصلے چڑھے ہوئے۔ سینکڑوں روپے کے مقابلہ میں اب ساٹھ ستر روپے ماہوار حقیقت ہی کیا رکھتے تھے۔ جائداد بکنی شروع ہوئی۔ باپ نے ہر چند سمجھایا، ماں نے بہتیرے نشیب و فراز دکھائے۔ مگر انجمن کا سالانہ جلسہ مدراس کا تھا۔ شرکت لازمی اور جانا ضرور۔ جوڑے اور کرایہ، اور وہ قرض دو ہزار روپے کو ایک مکان فروخت ہوا۔ قصہ کوتاہ ایک پانچ سال میں ساری جمع پونجی خالصے لگ گئی۔ اس وقت پھر ایک دفعہ باپ نے اور ماں نے، بہنوئی نے، اور بہن نے کہا کہ "روٹی تم کو اور تمہارے کتوں کو یہاں اکیلی پڑی ہو، ہمارے ہاں آؤ۔ جو دال دلیا اللہ نے دیا ہے کھاؤ۔ اور خدا کا شکر کرو"۔ مگر خدا معلوم جھوٹی غیرت تھی، یا روکھی پھیکی نکنت۔ منافرت کا اثر تھا یا تہذیب جدید کا خبط کہ ماں نے منتیں کیں۔ باپ نے خوشامد کی، بہنوئی نے سمجھایا، اور بہن نے ناک رگڑی، مگر اس نے منظور نہ کیا۔

بچہ کا دہا کا کچھ کم نہ تھا۔ اس پر افلاس کی مصیبت اور اتنی سنگین کہ جو ہاتھ بھر بھر مٹھی روپے اور اشرفیاں لٹاتے تھے، وہ اب ایک ایک روپے کو ترسنے لگے۔ ماما ئیں کم تو حسن کی زندگی ہی میں ہو چکی تھیں۔ ایک البتہ اپنے دم کی تھی۔ اب اس کو بھی الگ کرنا پڑا۔ یہ انقلابات ایسے نہ تھے کہ شاھن کا پیچھا چھوڑ دیتے۔ گھنٹوں بیٹھی اپنی حالت پر غور کرتی اور روتی۔ جن کا ہر وقت سسٹر سسٹر کہتے منہ خشک ہوتا تھا وہ اب آکر جھانکتی بھی نہ تھیں۔ دن رات کنڈی لگائے اکیلی ٹڑوں ٹوں پڑی رہتی۔ باپ کی مرضی اور ماں کی مامتا تھی۔ وہ دونوں وقت

کھانا بھیجتے۔ مگر ہاتھ پاؤں تھک چکے اور صحت بگڑ چکی تھی مشکل سے ایک آدھ نوالہ کھا سکتی۔

اب البتہ شاہدہ کو معلوم ہوا کہ کیا کیا اور کیا کر چلی۔ دور کے ڈھول سہاونے مدت فقط ظاہری ٹیپ ٹاپ کی داہن تھی۔ جس کا باطن زہر آلود اور سم قاتل مگر کیا کر سکتی تھی۔ وقت نکل چکا۔ سب سے بڑی چیز ندامت تھی۔ جو ہر وقت سر پر سوار تھی۔ افکار کا ہجوم۔ آلام کی بھرمار۔ بخار شروع ہوا۔ باپ نے تو کچھ نہ کیا۔ مگر ماں نے ایک دفعہ اور کوشش کی کہ ساتھ لیجاؤں۔ لیکن ناکام رہی۔ افکار رہے سوار۔ بخار رم گیا۔ اور ایک پندرہ ہی دن میں فیل کا فیل شاہدہ سوکھ کر چھپٹی ہو گئی۔ مرے کو مارے شاہ مدار پیٹ میں ایک درد ایسا اٹھتا تھا۔ کہ مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔ باپ نے مسیوں کو دکھایا سب نے رائے دی اندر پھوڑا ہے۔ علاج ہر چند ہوئے۔ مگر فائدہ کی کوئی صورت نہ نکلی تو ایک روز ماں نے اس سے کہا:۔

"بیٹی زندگی کا پہلا حصہ ختم کے قریب، اور دوسرا شروع ہونے والا ہے۔ ختم ہونے والا فانی، اور شروع ہونے والا ابدی ہے۔ یہ مٹنے والا اور وہ رہنے والا۔ یہاں سکھ عارضی، اور دکھ چند روزہ ہے۔ وہاں کے ثواب مستقل، اور عذاب اٹل ہیں۔ یہ سوانگ دیکھ لیا۔ اب وہ رنگ دیکھنا پڑے گا۔ یہ نئی جگہ اور غیر لوگ تھے، وہ انوکھی جگہ ہے، نہ اجنبی مقام۔ دیکھا بھالا گھر، جانے بوجھے لوگ، ملنے کو پکی پکائی کھیتی تیار اور چنا چنایا گھر موجود۔ اب تک کے خیالات سخت، دعوے شدید، اور رائیں مضبوط تھیں۔ مگر آج وقت ہے کہ طبیعت پر زور دو، اور ایمان سے پوچھو کہ جو سفر درپیش اور جو منزل سامنے ہے اس کے واسطے ضرورت کیا ہے۔ اور کیا کیا۔ غور کرو کہ اس زندگی کی کوششیں، اور سوچو کہ یہاں کے تمام کام کس قدر خلوص پر مبنی، اور صداقت پر محمول تھے۔ اس وقت کہ اس دنیا کے ہر

تعلق سے فراق ابدی ہوکر وہاں جاتی ہو جہاں ہمیشہ رہنا اور سہنا ٹھہرنا اور لیسنا ہے کس طرح چلیں اور کیونکر رخصت ہوئیں۔ آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا؟ ساتھ کیا لیا اور پاس کیا رکھا۔ کتنا نازک ہے یہ وقت اور عبرت انگیز یہ سماں کہ مجھ کرموں جلی ماں اور بدنصیب باپ کے سوا اس عورت کی میت پر جو چالیس برس دُنیا میں رہی۔ کوئی دو آنسو گرانے وارنہ ہوا اظہار ملال محض اخباروں تک محدود رہے۔ زبان دُنیا بھر کے جن کاموں میں گرفتار رہی، دماغ زندگی کے جن جھگڑوں میں اُلجھا رہا اس وقت وہی تصویریں آنکھ کے سامنے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ زبان کلمۂ توحید ادا کرتی، اور دماغ مالک حقیقی کے خوف سے تھرا اُٹھتا پٹی کے اردگرد مسلمان عورتیں کلام پاک کی صداؤں میں جو قدامت کا جوہر تھا تم کو دُنیا سے وداع کرتیں اور بجائے کہاروں کے کندھوں اور گاڑی کی چھتوں کے مسلمان شہنشاہ حقیقی کا فرمان پڑھتے ہوئے اپنے پاک کندھوں پر باوضو تمہارا جنازہ لیجاتے۔ آج جدت تم کو ان سب چیزوں سے محروم کرتی ہے۔ مگر اس لئے کہ ابھی دماغ صحیح اور زبان کام کے قابل ہے۔ بیٹی سمجھاتی ہوں کہ افلاس کی مصیبتیں، جُدائی کے صدمے، اور ناکامی کے رنج، اس بازپرس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ توبہ کرو، معافی مانگو، روؤ اور گڑگڑاؤ۔ رحیم ہے کریم ہے۔ شاہدہ کلمہ پڑھو اور کہو:۔

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

دُنیا آج ختم ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہاں کی اُمنگیں اور حسرتیں بھی۔ اب معاملہ اس سے ہے جو حقیقی حاکم، اور سچا مالک۔ جہاں پل پل کا حساب اور تل تل کا مواخذہ۔ ہاتھ اُٹھا، ان ہاتھوں کو جوڑ، یہ وقت آخر یہ سانس مہمان، اور دُنیا ختم ہے۔ گواہ کر مجھ کو اپنے اسلام کا اور اقرار کر باپ کے سامنے توحید کا، پناہ

مانگ اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر اور بیچ اُس روز کے عذاب سے جسکی شام نہیں۔ ماں اور باپ جو عاشق زار تھے دونوں چھوٹتے ہیں۔ اور دُنیا اور زندگی جسکی دیوانی رہی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ابھی وقت باقی اور موقعہ موجود ہے"۔

ماں یہاں تک پہونچی تھی کہ شاہدہ پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے ماں کیطرف ہاتھ جوڑکر "ہاں موت میرے سر پر آپہنچی۔ اور جس چیز کو میں عمر بھر بھولتی رہی اب اس سے چھٹکارا نہیں۔ اس وقت بھی کہ اذیت کے مارے جان نکل رہی ہے اور تکلیف نے جان پر بنا رکھی ہے۔ جہاں اپنی بہت سی غلطیوں پر نادم ہوں وہاں نہایت ادب سے عرض کرونگی کہ مجھے اب بھی آپکی بعض باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ دُنیا اچھے اور بُرے، فرمانبردار اور گنہگار بندوں سے بھری پڑی ہے۔ اس دُنیا نے مجھ سے بھی زیادہ گنہگار عورتوں کو دھکے دیکر نکالا ہے۔ بیشک میں روسیاہ ہوں، اور زندگی بُرائیوں سے لتھڑی ہوئی ہے۔ لیکن خدا نے اپنے رحم وکرم سے بڑے بڑے سرکشوں کا بیڑا پار کیا ہے۔ اسی کے فضل کی توقع مجھے بھی ہے۔ آپ کے خیالات آپکی زندگی، آپ کی تلقین، امتِ مرحومہ کے لئے بہت کچھ مفید، اور میں خدا کو شاہد کرتے ہوئے کہتی ہوں کہ آپ کا وجود اگر مسلمانوں کے واسطے نہیں تو اسلام کے واسطے بسا غنیمت ہے۔ لیکن وہی خدا جسکو میں گواہ کر رہی ہوں اچھی طرح جانتا ہے کہ میں اس وقت بھی اس رائے پر صداقت سے قائم ہوں کہ قدامت دَورِ حاضرہ میں اصلاح کی محتاج ہے۔ اور اگر آپ جیسی محترم خواتین اس طرف توجہ فرماکر قدامت اور جدت کو گلے ملوادیں تو قوم اور مذہب دونوں پر ایک بڑا احسان ہوگا۔ اماجان! باوجود ان تمام عیوب کے جو جدت میں موجود ہیں یہ بلا ٹلنے والی نہیں۔ اور ان مسلمانوں کے واسطے سوا اسکے کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ وقت کا ساتھ دیں۔ اور اپنے آبائی جوہر جنکو مجھ بدنصیب نے ہمیشہ ٹھکرایا محفوظ رکھیں۔ اور مذہب کو اپنا جزوِ اعظم قرار دیں۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بعد دُنیا کی ہر خوشی اور زندگی کی ہر مسرّت آپکے زخم پر نمک چھڑکے ہوگی۔ اور میری موت آپکی زندگی کو مردہ کر دیگی۔ لیکن میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جو کچھ میں چھوڑ رہی ہوں اس میں کا نصف مدرسے کے واسطے وقف ہو۔ آپ کوشش فرمائیے کہ ہمارے مدرسہ سے ایسی لڑکیاں نکلیں جو سموئی ہوئی ندامت کے نمونے ہوں اور اسلام کی برکتیں اُنکے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوں۔"

کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شاھدہ نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"آپ نے مجھے یٰسین سُنائی مگر میری رُوح اس وقت تک پرواز نہ کرے گی۔ جب تک میں اپنے جرائم کی سزا کا پورا مقابلہ نہ کر لوں۔ اور جب تک دُنیا کے طاقتور اچھی طرح نہ دیکھ لیں کہ کمزوروں پر ستم توڑنے والے ظالم کو کس طرح موت آتی ہے۔ میں اب بھی یہ کہتی ہوں کہ مجھے حقوق اللہ کا زیادہ اندیشہ نہیں ہے۔ ہاں خدا کی کمزور لاچار مخلوق جو میرے ہاتھوں تاراج و تباہ ہوئی۔ یقیناً مجھ سے بدلہ لے گی۔ اور لے رہی ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے سچی ہمدردی ہے تو منیرؔا اور رحیمؔا کو بلائیے۔ میں اُن سے اپنے مظالم کی معافی مانگوں اور بقیہ نصف وقف ان کی خدمت میں پیش کروں کہ ان کی دعائیں میری اذیت کا خاتمہ کریں۔۔۔۔

امّاں جان! خدارا جلدی کیجئے۔ میرا دم نکلتا ہے۔ اور رُکتا ہے ایک تکلیف ہو تو کہوں۔ یہ جسم جیتے ہی جی آگ میں بُھن رہا ہے۔ عقل اسکو بخار کہہ کر مطمئن ہو جائے۔ مذہب اس کو عذاب بتائیگا۔ درد اور کسک کی موجیں ہیں کہ بدن کے ہر حصّے سے اُمنڈ رہی ہیں۔ ہائے کیا کروں"

شاھدہ اسی طرح تڑپ رہی تھی کہ زاھدہ رحیمؔا اور منیرؔا کو لیکر اندر داخل ہوئی۔ انکی صورت دیکھتے ہی ماں ہاتھ جوڑتی ہوئی اُٹھی تو رحیمؔا نے رو کر کہا:۔

"بیگم مجھے کیوں گنہگار کرتی ہو" - ماں نے پھر ہاتھ جوڑے اور کہا :-

"زندگی کی نخوت اور خودداری کے جھوٹے گھمنڈ نے جو آجکل کی لڑکیوں کا شیوہ ہوگیا ہے - بدنصیب شاہدہ کی آنکھوں پر پردے ڈالدیے - اور اس نے وہ حرکتیں کیں جو موت کے دروازے پر قصر زندگی کے لینے والوں کے واسطے سبق ہیں - میں تم سے اور لواحقین سے پرانت التجا کرتی ہوں کہ اس کا قصور معاف کردو - اپنی غلطیوں کی پاداش میں یہ اپنی آدھی جائداد تمہاری خدمت میں پیش کرنی ہے - یہ دستاویز قبول کرو - اور دعا کرو کہ خدائے وحدہ لا شریک اس پر رحم کرے - موت کی سختی اور قبر کا عذاب اس پر آسان ہو - اور قیامت کے مواخذہ سے محفوظ رہے"۔

اس وقت شاہدہ نے دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے - اس کی روتی ہوئی آنکھیں ندامت سے جھکیں اور اتنا کہہ سکی :-

"خدارا میری خطا سے درگذر کیجیے"

رحیمؔا کی بھی ہچکی بندھ گئی تھی - اُس نے شاہدہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا :-

"بیگم خدا تمہاری ماتا ٹھنڈی رکھے - اور شاہدہ بیوی کی عمر میں برکت دے - مجھے زاہدہ بیوی رستہ بھر یہی سمجھاتی لائی ہیں - میں اس وقت پرانے جھگڑے نہیں چھیڑتی - میں نے دل وجان سے معاف کیا - خدا معاف کرے"۔

اتنا سنتے ہی شاہدہ کے منہ کی زردی اطمینان کی ایک خفیف سی سرخی میں تبدیل ہوئی - اُس نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے - اور دل ہی دل میں جو کچھ کہا وہ صرف ہونٹوں کی حرکت سے ظاہر ہوا مگر الفاظ سمجھ میں نہ آسکے -

اب شاہدہ کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر بالکل خاموش ہوگئی - پھر زاہدہ کو

اشارے سے زیب بلایا، گلے سے لگایا، اور آہستہ سے کہا:-

"میرا یہ پیام مسلمان لڑکیوں تک پہونچا دینا۔

"تعلیم جدید کے خبط نے میری دُنیا اور زندگی کو برباد کر دیا۔ ضرورت تھی کہ دُنیا میرے واسطے جنت اور زندگی دوسروں کیواسطے راحت ہوتی مگر میرے یہ دونوں جوہر غارت ہوگئے۔

اب میری دُنیا ختم ہو رہی ہے اور اصلاح اور احتیاط تو درکنار وہ وقت ہے کہ بچنا بھی نہیں سکتی۔ افسوس بات نہیں کیجاتی .... ہر وہ چیز جسے اپنا سمجھ رہی تھی مجھ سے آنکھیں بدل گئی۔ یہانتک کہ جسد خاکی کے اعضا بھی بے وفائی کر رہے ہیں۔ اور سب نے مجھ سے منہ موڑ لیا .... تم مسلمان لڑکیوں کو یہ الفاظ پہونچا دینے کی ذمہ دار ہو کہ مسلمان لڑکیاں اگر دُنیا میں کامیاب ہو سکتی ہیں تو صرف مذہب کے سایہ میں۔ جس گھر نے جس لڑکی نے مذہب کو ٹھکرایا وہ یاد رکھے کہ دُنیا اس کو کتے کی موت مارے گی .... ہائے زاھدہ کیا کروں بات نہیں کی جاتی ......

اس کے بعد رُک رُک کر شاھدہ کچھ اور باتیں جو اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکتی تھیں کر رہی تھی کہ روز روشن کی وداع کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہوگئی۔

ختم شد

اطلاع و انتباہ

جوہر قدامت سنہ ۱۹۱۹ء کی تصنیف ہے اور ہزاروں کی تعداد میں کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ جنوری سنہ ۳۴ء میں حضرت مصنف مرحوم نے اس پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ جوہر قدامت کا دائمی حق اشاعت محفوظ ہے۔ کوئی صاحب اسے یا اسکے کسی حصہ کو چھاپنے اور شائع کرنے کا قصد نہ فرمائیں۔ ورنہ اخلاقی ہی نہیں قانونی جرم کے بھی مرتکب ہونگے۔ اور نہایت بُرا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

رازق الخیری دفتر عصمت دہلی

مصورِ غم

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے)
شاہجہان آباد کے اس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ
کے استاد ہونے کا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا۔ جس نے مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم مولوی
عبدالقادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبدالرب غفور بانی
جامع مسجد سہارنپور جیسے جید علماء اور قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ اجڑے دیار کا
وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ حاجیہ قاریہ ام عطیہ النساء مرحومہ (چھوٹی استانی جی)
اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد شمس العلماء مولوی
نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری سنہ ۱۸۶۸ء میں پیدا
ہوئے اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبدالواجد صاحب
نے حیدرآباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے انتقال فرمایا۔ اور حضرت علامہ مرحوم
کی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم اور خالو مولوی
عبدالحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مغفور
نے اردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انھوں
نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم (جو علامہ مرحوم کے
حقیقی پھوپھا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند
لگا دیے اور ابھی حضرت علامہ اٹھارہ ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبدالرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجر کی اکلوتی صاحبزادی
سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت
شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی اور دفتر کے خشک
کاموں میں جی نہ لگتا تھا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز
کے لئے گوارا نہ کر سکتی تھیں ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی۔ اور ترقی کے نہایت معقول مواقع
میسر آئے پر ان کی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی۔ اور اٹاوہ۔ مین پوری۔ میرٹھ۔ علی گڑھ۔ دہرہ دون

کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبدیل ہو گئے۔ مگر چند سال گذرے تھے کہ
سنہ ۱۹۱۰ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ
یا صالحات" ہے جو سنہ ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف "منازل السائرہ"
ختم کی۔ ان دونوں اصلاحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ مصنف
کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ سنہ ۱۹۰۳ء سے رسالہ "مخزن" میں افسانے اور مضامین شائع
ہونے لگے۔ پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی۔ اور دلی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلآویزی زبان کی
شیرینی اور واقعات کے پیرایہ بیان کی دردانگیزی کی دھوم مچنے لگی۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں رسالہ عصمت جاری
کیا۔ جو ۴۳ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زنانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔
سنہ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ "تمدن" جاری کیا۔ جو پانچ سال تک بڑی خوبی کے
ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں اخبار "سہیلی" جاری فرمایا۔ مگر سنہ ۱۹۱۶ء میں دفتر "عصمت"
میں قیامت کی آگ لگی۔ اور سہیلی جاری نہ رہ سکا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں "شام زندگی" شائع ہوئی اور اسے
وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی۔ اس کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور
کو مصور غم کا خطاب دلوایا۔ اب اردو کے بے مثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا۔ اور دو درجن کے
قریب ضخیم کتابیں سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں۔ جو مختلف حضرات نے شائع کیں
اور بقول ایک ادیب "لاکھوں روپیہ پیدا کیا"۔ حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید
اردو کے کسی مصنف کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے
عرصہ میں دس دس بارہ بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ "صبح زندگی" "شام زندگی" وغیرہ کے تو پندرہ پندرہ بیس بیس
ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں "آمنہ کا لال" "سیدہ کا لال" بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزارہا کی
تعداد میں پانچ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کورس علامہ مغفور سے صحیح کرائے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں نیشنل
یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو ممتحن مقرر کیا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں حکومت بہار و اڑیسہ نے شمالی ہند سے بحیثیت ماہر
اردو کے اردو ہندی کی ترقی کے سلسلہ میں حضرت مرحوم سے بیش بہا مشورے لیے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں مسلمان بچیوں کے لیے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں
کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم و نادار بچیوں نے بحیثیت بورڈر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور جس سے ہزارہا
غریب کم استطاعت بچیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں۔ اس مدرسہ کے لیے بیگم صاحبہ محترمہ کے